نگار

ایک غلطی کی تصحیح

پچھلے پرچہ میں صفحہ ۶۷، سطر ۲۱ پر آرزو صاحب کا شعر غلط نقل ہو گیا۔
اس کی جگہ یہ شعر ہونا چاہئے تھا:۔

بے سہاروں کا سہارا کچھ نہ پوچھ — سوتے ہیں ہاتھ اک سرہانے دھر کے ہم

چندہ کی صراحت

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر بوجہ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل ہوگا

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۴۱ | فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۴۲ء | شمار ۳

ملاحظات ---------- ۱
تخئیل و محاکاۃ ---------- متجز سہسوانی ---------- ۵
محمودی رسم خط ---------- محمود علی خاں بی۔ اے ---------- ۸
شادی کی رسمیں اور انکی عمرانی اہمیت ..... خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے ---------- ۱۴
اب سے ساٹھ سال بعد ---------- ۱۷
پٹرول اور موجودہ تمدن ---------- صدرالدین عظیم ---------- ۱۹
مکتوبات نیاز ---------- ۱۲
وقت کی باتیں ---------- ۲۷
معلومات عامہ ---------- ۲۹
باب الاستفسار ---------- ۳۱
مطبوعات موصولہ ---------- ۳۳
منظومات ---- مرزا جعفر علی خاں اثر۔ پروفیسر شور۔ پروفیسر فراق تمکین سرست ۳۷

ملاحظات

واقعۂ قرطاس

اس سے مراد وہ واقعہ نہیں جو اس وقت تک سنیوں اور شیعوں کے درمیان باعث نزاع بنا ہوا ہے، بلکہ موجودہ جنگ میں کاغذ کی گرانی اور نایابی کا واقعہ ہے۔ قارئین نگار میں سے غالباً کم حضرات کو معلوم ہوگا کہ وہ کاغذ جو اکثر و بیشتر اخبارات و رسایل میں استعمال ہوتا ہے اُسے "نیوز پرنٹ" (News Print) کہتے ہیں اور یہ کاغذ پہلے ناروے سے آتا تھا۔ جب جرمنی نے ناروے پر قبضہ کر لیا تو یہ کاغذ کناڈا سے آنے لگا مگر اس کی قیمت بہت بڑھ گئی اور ملنا بھی دشوار ہو گیا

ان حالات کے زیر اثر ہندوستان کے اخبار نویسوں نے مرکزی حکومت کو متوجہ کیا اور بڑی مشکل سے یہ طے پایا کہ حکومت، کاغذ کا راشن مقرر کر کے لائسنس جاری کرے اور اس لائسنس کے ذریعہ سے اخبارات کاغذ حاصل کریں۔ اسی کے ساتھ ہندوستان میں چار پانچ کاغذ فروش کمپنیاں بھی نامزد کر دی گئیں تاکہ وہ اخبارات و رسایل جو براہ راست کناڈا سے کاغذ حاصل نہیں کر سکتے ان کمپنیوں کو اپنی طرف سے نامزد کر دیں اور یہ کاغذ فراہم کریں

یہ انتظام بظاہر بہت مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن اس پر عملدرآمد ہونے میں اتنی دیر ہوئی اور دفتری کارروائیوں نے اتنا وقت لے لیا کہ بہت سے اخبارات و رسایل ابتک اس سے فایدہ نہیں اُٹھا سکے اور اُن شکایتوں کی وجہ سے جو کاغذ فروشوں کی طرف سے پیدا ہو رہی ہیں، شاید آیندہ بھی کوئی فایدہ نہ حاصل ہو سکے گا۔ بہر حال جب صورت یہ پیدا ہو گئی تو نگار کے لئے بھی حصول کاغذ کا یہی طریقہ اختیار کیا گیا اور باوجود اس کے کہ انتہائی کمی کے بعد صرف ۲۵ رم ماہوار کاغذ طلب کیا گیا، حکومت نے صرف ۲۰ رم ماہوار کا لائسنس جاری کیا۔ ہر چند ماہوار پانچ رم کی کمی بھی کم نہ تھی، لیکن حالات کو دیکھ کر اسی کو غنیمت سمجھا گیا اور جس کمپنی کو ہم نے نامزد کیا تھا اس سے راشن کے مطابق کاغذ طلب کیا گیا، لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی

جب اس نے کہا کہ وہ آیندہ جون تک دس رم ماہوار سے زیادہ کاغذ نہیں دے سکتی اور جون کے بعد کر سکتی وہ کوئی وعدہ نہیں کر سکتی کیونکہ کناڈا سے کاغذ پہونچتے رہنے کا کوئی یقین نہیں ہے ظاہر ہے کہ دس ریم ماہوار کسی طرح ہمارے لئے کافی نہیں ہو سکتا، لیکن چونکہ اس بُرے وقت کے خیال سے ہم نے لڑائی شروع ہوتے ہی کئی سو ریم کاغذ اسٹاک کر لیا تھا، جس میں سے اب بھی کچھ محفوظ ہے، اس لئے اب دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی تھیں، ایک یہ کہ نگار میں کوئی اور دبیز، چکنا کاغذ لگایا جائے یا پھر دس رم ماہوار کے راشن اور اُس اسٹاک کو سامنے رکھ کر جو ہمارے پاس باقی رہ گیا، حجم کم کر دیا جائے۔ صورت اول پر عمل کرنے کے معنی یہ تھے کہ دو سو روپیہ ماہوار کا زاید خرچ برداشت کیا جاتا اور یہ ممکن نہ تھا، اس لئے دوسری صورت اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ نگار کا حجم نصف کر دیا گیا اور جب تک کاغذ راشن کے مطابق ہم کو نہ ملے گا، یہی حجم رہے گا

اس صورت میں قدرتاً آپ کو یہ خیال پیدا ہونا چاہئے کہ جب حجم کم ہوا ہے تو رسالہ کی قیمت میں بھی کمی ہونا چاہئے، لیکن آپ کا یہ خیال کرنا درست نہ ہوگا کیونکہ نگار کا مسطر اتنا گنجان اور خط اس قدر باریک کر دیا گیا ہے کہ ۸۰ صفحات میں پورے ۱۰۰ صفحات کا مواد آپ کو ملے گا اور اس طرح جہاں تک مضامین کا تعلق ہے نگار کا حجم وہی ۱۰۰ صفحات کا باقی رہا جو لڑائی سے پہلے تھا اور آپ کو پانچ روپیہ سالانہ میں مواد کا اتنا ہی سامان بہم پہونچا جو پہلے ملتا تھا

اُمید ہے کہ قارئین نگار ہماری ان دشواریوں کا خیال کر کے اس عارضی انتظام کو گوارا فرمائیں گے اور موجودہ مسطر کی باریک و گنجان تحریر کے پڑھنے میں انھیں جو دقت ہوگی، اُسے ہماری مجبوریوں کا لحاظ کر کے کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیں گے

سنگاپور کے بعد؟

موجودہ جنگ میں اس وقت تک تین نقصانات اتنے بڑے ہوئے ہیں کہ ان کی تلافی آسان نہیں۔ ایک، پچھلے اگست میں جرمن حملہ روکنے کے لئے روس کا دریائے ڈنیپر کے بند کو توڑ دینا، دوسرے سنگاپور کا برطانیہ کے ہاتھ سے نکل جانا اور تیسرے جاپانی قبضہ سے پہلے ہی پلمبانگ کے ذخایر پٹرول میں آگ لگا دینا۔ ان نقصانات کا اندازہ روپیہ آنہ پائی میں کیا جائے یا سیاسی حیثیت سے دونوں طرح ان کی اہمیت بڑی زبردست ہے۔ دریائے ڈنیپر کا بند طیار کرنے میں روس نے اتنی دولت، اتنی محنت اور اتنا وقت صرف کیا تھا کہ اگر ہم ان کی مجموعی قیمت کا اندازہ لگائیں تو اس سے شاید کئی سلطنتیں خریدی جا سکتی ہیں، اسی طرح سنگاپور کی قلعہ بندیوں میں جتنا روپیہ اور جتنی ذہانت برطانیہ نے صرف کی تھی وہ بھی تمام برطانوی مستعمرات کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتی اور پلمبانگ میں جتنا پٹرول ضایع کیا گیا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آجتک شاید ہی کسی حکومت نے اتنی بڑی دولت کو اپنے ہاتھ سے برباد کیا ہو جتنا ڈچ حکومت نے

اب دوسری حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دریائے ڈنیپر کا بند ٹوٹنے کے بعد روس کا خوشگوار اقتصادی و زرعی مستقبل کم از کم ۲۵ سال زیادہ دور ہو گیا، پلمبانگ کے ذخایر پٹرول ضایع ہو جانے سے بحر پاسفک میں اتحادیوں کی بحری قوت کا ایک بڑا چشمۂ حیات خشک ہو گیا اور سنگاپور کے سقوط نے مشرق بعید کی جنگ میں سخت خطرناک پیچیدگیاں پیدا کر دیں

اس میں شک نہیں کہ ملایا پر جاپانی قبضہ ہو جانے سے سنگاپور کی مدافعانہ اور جارحانہ دونوں حیثیتیں بہت گر گئی تھیں اور اگر جاپانی فوجیں وہاں داخل نہ ہوتیں تو بھی برطانیہ اب اس بحری مرکز سے کوئی فایدہ نہ اُٹھا سکتا تھا۔ تاہم یہ واقعہ لڑائی کے مستقبل پر غیر معمولی اثر ڈالنے والا ہے اور اس لئے اب سنگاپور اور ملایا کی ناکامی پر واویلا مچانے کی جگہ ہمیں جنگ کے مستقبل پر غور کرنا چاہئے۔ جو خطرہ آنے والا تھا وہ آچکا، لیکن جو آیندہ آنے والے ہیں وہ ابھی نہیں آئے ہیں اور انھیں کے مقابلہ کی فکر ہم کو کرنا چاہئے

سنگاپور کے سقوط کے بعد قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جاپان اب کیا کرے گا۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سب سے پہلے ہندوستان کا سوال آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ برما میں اس کا اقدام جاری ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو چین اور ہندوستان کے درمیان جو سلسلۂ اتحاد قایم ہے اس کو کافی صدمہ پہونچے گا، لیکن حملۂ ہندوستان کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے حملہ و دفاع کے اُن دونوں پہلوؤں کو سمجھ لینا ضروری ہے، جن کا تعلق سنگاپور سے تھا

اب سے پہلے تک جاپان کے لئے (تنہا جزیرۂ سنگاپور یا اس کی قلعہ بندیاں نہیں) جاپان پر حملہ کرنے کے لئے بہ نسبت دفاعی کام لینے کے بہت زیادہ اہم مقام تھا۔ مثلاً جنوبی پاسفک میں جاپان کے حملوں کی بنیاد اس کی بحری طاقت پر قایم ہے اور جب تک پاسفک کے اس حصہ میں اس کی بحری قوت زبردست ہے وہ ہر مقام پر جہاں حملہ کرنا چاہے اپنی فوجیں اور سامان جنگ بہ آسانی پہونچا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جاپان کے اس بحری تفوق کو کمزور کرنے کی صرف ایک یہی صورت ہو سکتی ہے کہ اتحادی اُس سے زیادہ بحری بیڑوں سے کام لیں۔ لیکن بحری بیڑوں سے کام لینا منحصر ہے اس بات پر کہ اُن کے قیام ان کی مرمت اور ایندھن کی فراہمی کا معقول انتظام ہو اور مشرق میں سنگاپور ہی ایسا بحری اڈا تھا جہاں ایک درجۂ اول کے بیڑے کو یہ تمام آسانیاں حاصل ہو سکتی تھیں

پھر چونکہ سنگاپور ہاتھ سے نکل گیا ہے اس لئے اتحادیوں کو بجبور اُ چھوٹے چھوٹے اور دور دور واقع ہونے والے اڈوں سے کام لینا پڑے گا اور اس کا اثر اتحادیوں کی جارحانہ

کارروائیوں پر پڑنا یقینی ہے۔ اگر سنگاپور ہاتھ سے نہ جاتا تو یہاں سے جاپان کی بحری نقل و حرکت کو آسانی سے روکا جا سکتا تھا، لیکن اب حملہ کے لئے اسوقت کا انتظار کرنا پڑیگا جب کوئی دوسرا موزوں بحری اڈا ہاتھ آجائے اور اسی لئے ماہرین جنگ کا خیال ہے کہ سنگاپور کے نکل جانے نے لڑائی کو زیادہ طویل کر دیا ہے

اب آپ دفاعی پہلو کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ سنگاپور، برطانیہ کا سب سے پہلا خط دفاع تھا اور اس کے نہ رہنے سے برما، آسٹریلیا، لنکا اور ہندوستان سب کی پوزیشن خطرہ سے قریب ہوگئی ہے، لیکن زیادہ مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ آیئے، اس وقت ہندوستان ہی کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ اگر جاپان نے اس پر حملہ کر دیا تو ہم اپنا دفاع کیونکر کریں گے

ہندوستان پر جاپانی حملہ کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو وہ خشکی سے براہ برما حملہ کرے یا براہ ملایا جہازوں کے ذریعہ سے خلیج بنگال تک پہونچے — پہلے بحری حملہ کو لیجئے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے بڑی زبردست فوج درکار ہوگی اور اس فوج کی نقل و حرکت اور اس کے لئے رسد و سامان جنگ پہونچانے کے لئے جاپان کو اپنے بہت سے جہازوں سے کام لینا پڑے گا اور اس کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ سنگاپور کی مرمت کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ بحری بیڑوں کا محفوظ اڈا بن سکے اور دوسرے یہ کہ جاپان اپنے بڑے بڑے جہاز دوسرے مقامات سے ہٹا کر اس طرف لا سکے۔ اور یہ دونوں باتیں آسان نہیں۔ سنگاپور کی مرمتیں ایسی معمولی نہیں ہیں کہ انھیں اس قدر جلد درست کیا جا سکے۔ اگر جاپان نے بہت عجلت سے کام لیا تو بھی درجۂ اول کا بحری اڈا بنانے کے لئے مہینوں درکار ہوں گے، رہا بڑے بڑے جہازوں کو دوسرے مقامات سے ہٹا کر ہندوستان کی طرف لانا، تو یہ بھی اس وقت تک آسان نہیں جب تک امریکہ کا بیڑا پاسفک میں موجود ہے۔ لیکن اگر ان دونوں باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اتحادیوں کی موجودہ دفاعی پوزیشن بری نہیں ہے۔ کیونکہ جاوا اور سماترا پر ابھی تک جاپانی قبضہ نہیں ہوا اور جب تک یہ اتحادیوں کے پاس ہیں، آبنائے ملاکا سے جاپانی جہازوں کا گزر کر ہندوستان، برما یا لنکا پہونچنا آسان نہیں۔ ہر چند ان جزیروں میں اتحادیوں کی اتنی فوج نہیں ہے کہ وہ جاپان کی ٹیٹری دل فوج کا مقابلہ کر سکے، لیکن وہ اس کی راہ میں حایل ہو کر اتحادیوں کو وقت سے فایدہ اٹھانے کا موقعہ ضرور دے سکتی ہیں

اسی کے ساتھ یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ بحر ہند اور خلیج بنگال میں بھی برطانیہ کی بحری قوت اتنی موجود ہے کہ وہ یہاں جاپانی جہازوں کی نقل و حرکت کو روک سکتی ہے۔ اسمائے ہندوستان پر کسی زبردست باقاعدہ بحری حملہ کا امکان اس وقت بہت ضعیف ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اس کی آبدوز کشتیاں، اور اس کے ہوائی جہاز، ہندوستان کے آس پاس نہ آسکیں گے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ سلسلۂ رسل و رسایل منقطع کرنے، لوگوں میں بے چینی پھیلانے اور برطانوی بیڑوں کو کسی دوسری طرف توجہ کرنے سے روکنے کے لئے وہ ہندوستان کے بعض ساحلی مقامات مثلاً کلکتہ و مدراس وغیرہ پر بمباری کی کوشش کرے گا، کیونکہ اگر اس کے طیارہ بردار جہاز بحر ہند یا خلیج بنگال میں نہ آسکے، تو بھی اس نوع کے حملوں کو کسی طرح نہیں روکا جا سکتا خواہ بحری قوت کسی کی کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو

کسی ملک پر حملہ ہونے کی صورت میں، سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود اس ملک کے ذرایع کیا اور کتنے ہیں اور دوسرے یہ کہ اسے باہر سے کمک پہونچ سکتی ہے یا نہیں۔ اور ان دونوں باتوں کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اول تو وہ خود اتنا بڑا ملک ہے کہ جاپان کے مقابلہ میں چین سے زیادہ نہیں تو اس کے برابر ضرور عسکری قوت فراہم کر سکتا ہے اور بیرونی کمک کے متعلق بھی اسے پورا اطمینان ہے کیونکہ برطانیہ اور امریکہ بحر روم کی طرف سے ہر طرح کی مدد فراہم کر سکتے ہیں اور جاپان ان کی راہ میں حایل نہیں ہو سکتا

اس میں شک نہیں کہ بحر پاسفک میں جاپان نے، دسمبر سے اسوقت تک غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ ان کامیابیوں پر جنگ کا فیصلہ ہونا ممکن نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ وہ عرصہ سے بحر پاسفک میں جنگ کی طیاریاں کر رہا تھا اور اتحادیوں کی طیاریاں اس کے مقابلہ میں بہت کم تھیں۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جب تک امریکہ اور برطانیہ نے اپنی طیاریاں پوری کرنے کے بعد بحر پاسفک میں اس کو چیلنج دیا تو مقابلہ آسان نہ ہوگا

یہ درست ہے کہ سنگاپور کے واقعہ نے وقت کے سوال کو اتحادیوں کے لئے اور زیادہ اہم بنا دیا ہے اور اس لئے ہم کو اگر کوئی نقصان پہونچا ہے تو صرف اتنا کہ نتیجہ کا انتظار ہم کو زیادہ عرصہ تک کرنا پڑے گا اور انتظار کی گھڑیاں سخت ہوتی ہی ہیں۔

روس کا محاذ جنگ

جاڑوں کے آغاز میں روس کے محاذ پر جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی، اس کا سلسلہ برابر جاری ہے اور جرمن فوجیں برابر پیچھے ہٹتی جا رہی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ تغیر صرف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ روس اپنی طیاریاں مکمل کر چکا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ شدید برفباری اس کا سبب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روس نے جس پامردی کے ساتھ جرمن فوجوں کا مقابلہ کیا اور جس ہمت و ولولہ کے ساتھ اس نے اپنی طیاریاں جاری رکھیں، اس سے یہ تو ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اوصاف ناطاقیوں کے وہ اپنے اور اتحادیوں کے ذرایع سے پوری طرح فایدہ اٹھانے کا اہل ہے، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہاں کے محاذ جنگ پر وقتاً فوقتاً ایسی تبدیلی

پیدا کردینے میں شدید سردی اور برفباری بھی بڑی حد تک شامل تھی اور اب کہ سردیاں ختم ہو رہی ہیں، اس میں تغیر ضرور رونما ہوگا، جیسا کہ ہٹلر کی تازہ ترین تقریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

سردیوں سے پہلے جرمن فوجیں، اوکرائن، سفید روس اور کریمیا کے علاقہ پر قابض ہو کر ایک طرف بحر آزوف تک پھیل گئی تھیں اور دوسری طرف ماسکو اور لینن گراڈ کی دیواروں تک اُن کی توپوں کی آواز پہونچنے لگی تھی، لیکن سردیوں کے آغاز کے بعد ہی جرمن اقدام کمزور ہو گیا اور روس نے جارحانہ کارروائی شروع کر دی

اس وقت تک روس کو جتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے، وہ اس لحاظ سے ضرور قابل ذکر ہے کہ اس نے جرمن سیلاب کو روک کر شدید خطروں سے نجات حاصل کر لی ہے لیکن ناتسی جماعت کے قدموں سے ابھی تک وہ اپنی زمین کو پاک نہیں کر سکا

اوکرائن، کریمیا اور سفید روس کے علاقہ میں جتنے اہم مقامات پر جرمن قبضہ ہو چکا تھا، وہ ابتک بدستور قایم ہے اور ماسکو کی طرف اسمولنسک بھی ابھی تک روسیوں کے ہاتھ نہیں آیا۔ اسی طرح لینن گراڈ کا محاصرہ بھی بدستور قایم ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جرمنی موسم بہار کے حملہ کے لئے تازہ فوجیں فراہم کر رہا ہے، بلکہ ان میں سے بعض فوجیں روس کے مقابلہ پر بھیجی بھی جا رہی ہیں، اس لئے یہ امید رکھنا کہ آیندہ بھی روس کا نقشۂ جنگ یہی رہے گا، صحیح نہیں۔ پندرہ بیس دن کے بعد جرمنی کا حملہ روس پر پھر شروع ہوگا اور دُنیا کی توجہ بیک وقت مشرق و مغرب دونوں طرف مبذول ہو جائے گی

ہر چند جرمنی کو اب وہ آسانیاں حاصل نہ ہوں گی جو اس سے پہلے حاصل تھیں، کیونکہ روس کو جاڑوں میں اپنی طیاریاں مکمل کرنے کا بھی موقعہ ملگیا ہے اور اسوقت تک اُسے جرمن فوجوں کی لڑائی کا تجربہ بھی ہو چکا ہے، تاہم ناتسی خطرہ سے روس کو نجات ملنا فی الحال ممکن نہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ سرما تک کوئی تازہ پیچیدگی جنگ کے نقشہ میں کوئی اہم تبدیلی پیدا نہ کر دے گی

مغرب میں، بحر اٹلانٹک، بحر روم، افریقہ، جبرالٹر، انگلش چینل اور مشرق میں ہندوستان، آسٹریلیا، سب کے سب خطرہ میں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ روس کے محاذ کے علاوہ کسی اور تازہ محاذ پر بھی جنگ شروع ہو جائے

افریقہ میں اب بھی لڑائی جاری ہے اور پلہ جرمنی کی طرف کا بھاری ہے، اس لئے برطانیہ ادھر سے اپنی توجہ نہیں ہٹا سکتا۔ اسی طرح انگلش چینل پر جو تازہ حملہ جرمنی نے کیا تھا، وہ بھی اس کا مقتضی ہے کہ سواحل انگلستان کو اور زیادہ مضبوط بنایا جائے۔ بحر اٹلانٹک سے جرمنی کے تین جہازوں کا بھاگ کر محفوظ نکل آنا، ایسا معمولی واقعہ نہیں کہ اس سمندر کی طرف سے اتحادی غافل ہو جائیں اور سنگاپور پر جاپانی قبضہ ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان اور آسٹریلیا کی طرف سے جو خطرے پیدا ہو گئے ہیں وہ بھی پوشیدہ نہیں، اس لئے ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ اتحادی اپنی ساری توجہ صرف روس کی طرف مبذول کر سکیں گے اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے، ہم روسی محاذ کے متعلق بہت زیادہ امیدیں قایم نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر امریکہ کی طیاریاں اس حد تک مکمل ہو گئیں کہ وہ اٹلانٹک اور پاسفک میں اپنے بحری بیڑے کافی تعداد میں پہونچا سکا، تو برطانیہ کی بحری قوت پر جو غیر معمولی دباؤ اسوقت پڑ رہا ہے، وہ یقیناً ہلکا ہو جائے گا اور اُس وقت حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو سکے گی

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان، جدہ اور سویز تک جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

سفری اور باربرداری کے جہازات بمبئی اور کراچی سے عدن۔ پورٹ سوڈان۔ جدہ اور سویز تک

مسافر اور مال و اسباب لے جاتے ہیں نیز بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور مارشیس تک سفر کرتے ہیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کیجا سکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے:- ٹرنر مارلیسن۔ اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶ - بنک اسٹریٹ - بمبئی

تخئیل و محاکاۃ

فن شعر و شاعری پر اُردو زبان میں آج تک جو کتابیں یا دیوانوں کے مقدمے اور تبصرے لکھے گئے ہیں ان سب میں تخئیل و محاکاۃ کی بحث اور تعریف مخصوص الفاظ اور خاص عبارتوں میں بیان کی گئی ہے۔ نیز ادبی و علمی رسایل و اخبارات میں کبھی کبھی اس کے متعلق مضامین نظر سے گزرے ہیں مصنفین کتب اور مضمون نگار اہل قلم نے جہاں شاعری۔ کی مبحث پر قلم اُٹھایا ہے اور شعر کی تعریف کی ہے وہاں تخئیل و محاکاۃ کا بیان بھی ان کو لازمی طور پر کرنا پڑا ہے۔ غالباً اُردو میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ بسط و تفصیل کے ساتھ اس بحث کو مولانا شبلی علیہ الرحمہ نے شعر العجم کی چوتھی جلد میں لکھا ہے اس کے بعد صناید العجم اور شعر الہند وغیرہ میں شعر العجم کی تحقیق کو چراغ راہ بنا کر اسی کی روشنی میں اشعار پر نقد و انتقاد کیا ہے اور اس تقلید جامد کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اگر کچھ بھی تحقیق سے کام لیا جاتا تو شعر العجم کے غلط مبحث کی گتھیاں سُلجھ جانے کی امید ہو سکتی تھی۔

مولانا شبلی مرحوم سیر و تاریخ و ادب میں قابل قدر تصنیفات کے مالک تھے ان کے طرز تحریر کا حُسن ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں شعر العجم ان کے مذاق سلیم کا دلچسپ کارنامہ ہے اہل ذوق نے اس سے فوائد حاصل کئے ہیں۔ لیکن مولانا نے تخئیل و محاکات کے مبحث کو ایک عقدۂ لاینحل بنا دیا ہے کہیں ان کو شعر کے اجزا بتاتے ہیں اور کہیں اُن کو شعر کی دو صنفیں ثابت کرتے ہیں اور کہیں تخئیل کو عیوب شعر میں شمار کرتے ہیں اور پھر ان کے مواقع استعمال جُدا جُدا بتاتے ہیں۔ شعر الہند میں شعرا کے کلام کو اسی معیار پر پرکھا ہے اور تخئیل کو ایک ناقابل عفو گناہ سمجھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان سہو و خطا سے بری نہیں ہو سکتا سچ ہے "الصارم قد ینبو والجواد قد یکبو"۔ بربنائے تقلید و حُسن ظن تخئیل و محاکاۃ کی غلط تعبیر عام ذہنوں میں راسخ ہو گئی ہے اور اب تک میرے علم میں کسی نے اس بحث میں محققانہ نظر سے کام نہیں لیا اس لئے شعر العجم کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھ کو اس مبحث پر قلم اُٹھانا پڑا اور اس سے مقصود صرف عام غلط فہمی کا ازالہ اور تقلید کی خرابی کو رفع کرنا ہے۔ چونکہ عام کجروی کا منشا صرف تخئیل، محاکات، اور تخئیل کی تعریف صحیح معلوم نہ ہونا ہے اس لئے ہم انھی الفاظ کا صحیح مفہوم بیان کر کے اغلاط عامہ کی توضیح کرتے ہیں۔

تخئیل: جو محسوسات و مدرکات انسان کے خیال میں موجود ہیں قوت متخیلہ دماغی ان میں تصرف کرتی ہے۔ مختلف اشیاء کو جمع کر کے طرح طرح کی صورتوں میں ترکیب دیتی ہے اور کبھی مجتمع اشیاء کو منتشر کرتی ہے کبھی ان کی ہیئت و صورت بدل دیتی ہے کبھی قلب ماہیت کر کے حقیقت شے کو متغیر کر دیتی ہے انھی تصرفات دماغی کو تخئیل کہتے ہیں اور یہ قوت تمام افراد انسانی میں یکساں نہیں ہوتی کسی میں کم کسی میں زیادہ پائی جاتی ہے لیکن اس کے اختراعات و تصرفات غیر محدود اور لاانتہا ہیں ایک شاعر نے قوت متخیلہ کی اسی حالت کو پیش نظر رکھ کر کیا خوب کہا ہے:

در بند آں مباش کہ مضمون نماندہ است — صد سال می تواں سخن از زاب یار گفت،

یہاں صد سال سے غیر محدود زمانہ مراد ہے۔ غیر ذی روح کو ذی روح غیر ناطق کو ناطق معدوم کو موجود غیر ممکن کو ممکن بنا دینا تخیل کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ محاکات اور تخئیل سب اسی کے افعال ہیں۔

محاکاۃ: باب مفاعلۃ کا مصدر ہے اس کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کی نقل اُتارنا اور چند چیزوں میں مشابہت قایم کرنا ہیں۔ اسی کو تشبیہ و تصویر کہتے ہیں۔ قوت متخیلہ جب اپنے محسوسات میں چند چیزوں کو باہم مشابہ پاتی ہے اور ان کو ایک سلک میں منسلک کر دیتی ہے تو اُن کو متحد ثابت کرتی یا قریب باتحاد پہونچا دیتی اور ایک کا حکم دوسرے پر لگاتی ہے اس کا نام محاکاۃ ہے۔ شاعر اس کو تشبیہ استعارہ، کنایہ وغیرہ میں دکھاتا ہے۔

تخئیل: باب تفعیل کا مصدر ہے اس کے معنی ہیں کسی کے دل میں کوئی خیال غیر واقعی پیدا کرنا اسی کو ایہام کہتے ہیں۔ شاعر جہاں کسی غائب یا غیر ذی روح یا غیر ناطق سے خطاب کرتا ہے تو سامع کو اس شے کے حاضر یا ذی روح یا ناطق ہونے کا تخیل ہو جاتا ہے اور یہ تخیل سامع کے ذہن میں بعض موقعوں پر یقین کا مرتبہ پیدا کر لیتا ہے۔ تخئیل اگرچہ ایک فریب و مغالطہ کی صورت ہے لیکن سامع کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا اور اس سے طبیعت کو لازمی طور پر انقباض و انبساط ہوتا ہے۔ جب کلام میں بذریعہ محاکات کوئی تخئیل پیدا کی جاتی ہے تو اس کو شعر کہتے ہیں صرف محاکاۃ یا صرف تخئیل کا نام شعر نہیں ہے بلکہ یہ دونوں شعر کے جزء لاینفک ہیں جن کا وجود ہر حال میں شعر کے لئے ضروری ہے۔

تخئیل شاعرانہ محاکاۃ کے ذریعہ ہوا کرتی ہے یعنی تشبیہ، استعارہ، کنایہ، اور استعارہ تخئیلیہ تخئیل کا قوی سبب ہوتے ہیں یعنی سامع کا خیال مشبہ یا مستعار منہ سے مشبہ بہ یا مستعار منہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ نقل کو اصل سمجھ کر اصل کا فایدہ نقل سے حاصل کرتا ہے۔

بانسری، ستار، ہارمونیم وغیرہ میں سازندہ جب محاکاۃ سے کام لیتا ہے یعنی موزوں کلمات کے مشابہ نغمات ادا کرتا ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوش گلو انسان گا رہا ہے۔ یہاں بھی محاکات تخئیل تک پہونچا دیتی ہے اور نقل بہ اصل کا گمان حد یقین تک پہونچ جاتا ہے لیکن یہ خود شعر نہیں بلکہ شعر یا کلام کی محاکات ہے۔ ارسطو نے کتاب الشعر میں لکھا ہے: "والاقاویل الشعریۃ ھی الاقاویل المخیلۃ"۔ یعنی اقوال شاعرانہ ہی کا نام اقوال مخیلہ ہے۔ ارسطو اسی کو کہیں محاکاۃ کہتا ہے اور کہیں تخئیل۔ کیونکہ محاکاۃ موجب تخئیل ہوتی ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے ارسطو کا مطلب نہیں سمجھا اور شعر العجم میں اس پر اعتراض کر دیا۔

بعض سطحی نظر اردو مصنفین نے تحقیق سے چشم پوشی کر کے مطلقاً تخئیل اور شعر کی خیال بندی و دقت آفرینی کو تخئیل اور محض حکایت و واقعہ نگاری کو محاکاۃ سمجھا ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی غلطی ہے جو شعر العجم کی بحث تخئیل و محاکاۃ کی تقلید سے رونما ہوئی ہے۔ شعر العجم جلد ۴ بحث تخئیل و محاکاۃ کی عبارت ذیل پر نظر کرنا چاہئے:

"ارسطو کے نزدیک یہ چیز (شعر) محاکات یعنی مصوری ہے لیکن یہ بھی صحیح نہیں اگر کسی شعر میں تخئیل ہو اور محاکاۃ نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟ سیکڑوں اشعار میں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخئیل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ اشعار خیال کئے جاتے ہیں..... حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخئیل ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا"

مولانا نے اس کے بعد دوسرے مقام پر اپنے خیال کی مزید توضیح فرمائی ہے اور شعر کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"تخئیل اور محاکاۃ اگرچہ دونوں شاعری کے عنصر اعظم ہیں لیکن بلحاظ اکثر دونوں کے استعمال کے موقعہ الگ الگ ہیں۔ یہ سخت غلطی ہے کہ ایک کے بجائے دوسرے کا استعمال کیا جائے مثلاً مناظر قدرت کا بیان محاکات میں داخل ہے۔ مثلاً اگر بہار، خزاں، باغ، سبزہ، مرغزار، آب رواں کا بیان کیا جائے تو محاکات سے کام لینا چاہئے یعنی اس طرح بیان کرنا چاہئے کہ ان چیزوں کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ متاخرین کی سخت غلطی جس سے ان کی شاعری بالکل برباد ہو گئی ہے یہ ہے کہ وہ ان موقعوں پر محاکات کے بجائے تخئیل سے کام لیتے ہیں"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخئیل اور محاکات کا صحیح مفہوم مولانا کے ذہن میں نہ تھا ورنہ یہ نہ لکھتے کہ "ان چیزوں کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے"، کیونکہ اسی کو تخئیل کہتے ہیں اور محاکات کسی حالت میں اس سے جدا نہیں ہو سکتی۔ محاکاۃ اور تخئیل کے موقعے الگ الگ سمجھنا اور ان کے باہم تفریق کرنا ایک نغمہ خارج از آہنگ ہے۔ منشا غلط یہی ہے کہ تخئیل کو دور از کار تخئیل اور محاکاۃ کو تخئیل سے جدا مان لیا ہے طرہ یہ کہ تخئیل و محاکاۃ کو شاعری کا عنصر اعظم تسلیم کیا اور پھر کل یا مجموعہ کو اپنے اجزاء سے مستغنی بھی ثابت کیا۔ آپ نے تمام بحث میں فرضی، ذہنی، خیالی، اور غیر ممکن و معدوم اشیا کی محاکاۃ کو تخئیل سمجھ کر اس کو عیب قرار دیا ہے اور درحقیقت یہ محاکاۃ کی بے اعتدالی ہے اسی طرح صرف حکایت و وقوع گوئی کو محاکاۃ بتا کر اس کو تخئیل سے (بزعم خود) خالی سمجھا ہے اور درحقیقت کوئی محاکاۃ تخئیل سے خالی نہیں ہوتی۔ بنائے فاسد علی الفاسد کے مثالیہ اشعار جو اپنے دعوے کے ثبوت میں درج کئے ہیں وہ دعوے کے خلاف شہادت دیتے ہیں مثلاً خالص محاکاۃ کی مثال میں اشعار ذیل پیش کئے ہیں ؎

نرمک نرمک نسیم زیر گلاں میخزد — عنبر ایں می کند عارض آں می مزد
سنبل ایں می کشد گردن اں میگزد — گہ بچمن می چمد گہ بسمن می وزد
گاہ بشاخ درخت گہ بلب جوئبار

مولانا کے خیال میں یہ محاکات ہے جس میں تخئیل کا نشان نہیں۔ لیکن ایک سطحی نظر انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ شاعر نے ایک عاشق و معشوق کے باہمی اختلاط کا نقشہ کھینچ دیا ہے نسیم کو عاشق اور گل کو معشوق بنا دیا ہے اور ان کے افعال و حرکات صاف بتاتے ہیں کہ یہ انسانی خواص ہیں۔ کیا یہ ایک زبردست تخئیل نہیں ہے اور کیا سامع کا ذہن اس کی طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ انسانوں کے حرکات ہیں۔ اسی طرح خالص تخئیل کی مثال میں یہ شعر لکھا ہے:

فروتنی ست دلیل رسیدگان کمال — کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

شاعر نے فروتنی کو دلیل کمال بتایا ہے اور اس کے ثبوت میں منزل پر پہونچکر سوار کا پیادہ ہو جانا پیش کیا ہے۔ یعنی منزل پر پہونچنے کو کمال سے تشبیہ دی ہے اور پیادہ پائی کو فروتنی سے تمثیل بعینہ محاکاۃ اور نقل مطابق اصل ہے مصرعۂ ثانی میں حرف تشبیہ چوں بھی موجود ہے۔ مولانا نے خود بھی لکھا ہے کہ "محاکاۃ کا بڑا آلہ تشبیہ ہے" پھر خدا جانے شعر مذکور کو محاکاۃ سے کیوں خالی بتایا۔ اسی طرح ؎

بنوعے آتش گل در گرفت است — کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

اس شعر میں آتش گل کو جو محض استعارہ تھا شاعر نے حقیقت قرار دیکر بلبل کو پانی میں آشیانہ بنانے کے لئے مجبور کر دیا ہے بالکل محاکاۃ ہے لیکن غیر معتدل اور دور از کار لیکن آتش گل کی تخئیل اس محاکاۃ کی متحمل تھی۔ اس کو محاکاۃ سے خالی کون کہہ سکتا ہے۔ شعر العجم اور اس کی مقلد شعر الہند دونوں نے محاکاۃ کی بے اعتدالی یعنی ذہنی و معدوم و غیر ممکن اشیاء کی محاکات کو تخئیل کہکر شعراء [illegible] اور اسی کو حسن و قبح اشعار کا معیار قرار دیا ہے اگر تخئیل و محاکاۃ کا صحیح مفہوم ذہن نشین ہوتا تو ایسی غلطی ناممکن تھی، تخئیل و محاکاۃ میں تفریق ثابت ہوتی

شعر محاکاتی و تخئیلی کی تقسیم ہوتی۔ تعریفات میں مجمل و مبہم الفاظ سے کام نہیں چلتا۔ محاکاۃ کو صرف تصویر کشی و بیان واقعہ سے تعبیر کرنے اور تخئیل کو رنگ بھرنے اور موقلم کو جنبش کہدینے سے تخئیل و محاکاۃ کی تعریف مطلق نہیں ہوسکتی اُردو مصنفین کو جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں وہ انھی بے معنی و مہمل الفاظ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اہل قلم نے بے سمجھے بوجھے انھی الفاظ میں محاکاۃ و تخئیل کی تعریف بیان کی اور جس شعر میں دقت آفرینی و نازک خیالی کی جھلک دیکھی اس کو تخئیلی شعر کہدیا اور جس میں واقعہ نگاری نظر آئی اس کو محاکاتی شعر سمجھا۔ اصناف سخن میں غزل قصیدہ مثنوی کو محاکاتی شاعری کا میدان بتایا گیا اور اس میں تخئیل کو بدترین عیب سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ شعر کی صحیح تعریف بھی کوئی نہیں بیان کرسکتا نہ اس کو خطابت و مصوری اور فلسفہ سے ممیز کرسکتا ہے۔ اہل قلم شعر کی تعریف میں جذبات کا لفظ لازمی طور پر ذکر کرتے ہیں چنانچہ شعر العجم میں بھی شعر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں"

معلوم نہیں جذبات سے کیا مراد ہے اور شعر کی تعریف اس کے ذریعہ سے کیونکر ہوگئی۔ ایک خطیب ایک فلسفی بلکہ ہر ایک علم و فن کا عالم اپنی تقریر و تحریر الفاظ میں ادا کرتا ہے اور سب میں جذبات شامل ہوتے ہیں۔ بعض حضرات نے زیادہ غائر نظر سے اس کو یوں رنگین و دلکش بنایا ہے۔ کہ "جذبات و احساسات جب برانگیختہ ہوتے ہیں اسوقت اضطراری طور پر جو کلام موزوں انسان کی زبان پر جاری ہوتا ہے اس کا نام شعر ہے" یہ بھی بالکل مہمل بات ہے۔ شعر اختیاری چیز ہے نہ کہ اضطراری۔ اور موزوں کلام کا بے اختیار سرزد ہونا بھی ایک ذہنی و فرضی بات ہے۔

اگر محاکاۃ و تخئیل کا صحیح مفہوم ذہن نشین ہو تو شعر کی تعریف یہی ہونا چاہئے کہ "جس کلام میں تخئیل و محاکاۃ ہو وہ شعر ہے" مصوری سے بھی امتیاز ہوگیا کیونکہ تصویر میں الفاظ اور کلام نہیں ہیں۔ سائنس یا فلسفہ چونکہ دلائل یقینی پر مبنی ہوتے ہیں اُن میں مغالطہ و فریب نہیں ہوتا اس لئے وہ بھی شعر سے خارج ہیں کیونکہ تخئیل ایک فریب ہے اور وہ شعر کا عنصر ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے ع "چوں الکذب اوست احسن او" خطابت میں لوگوں کے مسلمات و مشہورات سے کام لیا جاتا ہے خطیب بجائے تخئیل و محاکات کے دلائل خطابیہ اور قوم کے ذہنی و مذہبی مسلمات کو اپنے دعووں کی شہادت میں پیش کرکے ترغیب و ترہیب کا فرض ادا کرتا ہے لیکن شاعر کے مقدمات کا ذہن محض تخئیل و محاکاۃ پر مبنی ہوتے ہیں اور یہ بالکل بے حقیقت و غیر واقعی تخیلات ہیں۔ جو لوگ شعر کی صحیح تعریف سے ناآشنا ہیں وہ ان مباحث کی تفصیل میں ورق کے ورق سیاہ کر ڈالتے ہیں اور پھر بھی حقیقت منکشف نہیں ہوتی۔

شعر العجم کا یہ فقرہ کہ "خطابت مخاطبین و سامعین پر اثر دکھاتی ہے اور شعر خود شاعر کے نفس پر" عجیب و غریب دعوے ہے گویا شعر سے سامعین کے جذبات میں تلاطم نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کا اثر شاعر ہی تک محدود رہتا ہے۔ یہ حقیقت کے خلاف اور غرض شعر کے بالکل منافی ہے۔ شعر کی تاثیر کے یہ معنی ہیں کہ سامع کے جذبات کو بھڑکا دے۔ عرب کے ایک نقاد کا قول ہے کہ "اشعر الناس من انت فی شعرہ" یعنی بڑا شاعر وہی ہے جس کے شعر میں سامع ہمہ تن محو ہوجائے۔

ارسطو نے کتاب الشعر میں محاکاۃ شاعرانہ کے محاسن و معائب دونوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ اُردو کی بدقسمتی سے ہمارے مصنفین و ارباب قلم نے محاکاۃ کے عیوب کو تخئیل کی بہ اعتدالیاں بتایا ہے یہ غلطی بھی محاکاۃ و تخئیل کے معنی نہ جاننے کے باعث ظہور میں آئی ہے۔ کتاب الشعر سے چند عمدہ محاکاۃ کے انواع یہاں لکھے جاتے ہیں لیکن ہم نے بطور توضیح مثالوں کا بھی اضافہ کردیا ہے۔

(۱) محسوسات کی محاکاۃ محسوسات سے کیجائے تو بہتر ہے مثلاً ستاروں کی ایک خاص شکل کو تشبیہ کی بنا پر سرطان (کیکڑا) کہا جاتا ہے۔ آنکھ کو نرگس زلف کو سنبل کہنا اسی قبیل سے ہے۔

(۲) امور عقلیہ و ذہنیہ کی محاکات بھی امور محسوسہ سے ہونا چاہئے جیسے قید محبت، طوق احسان، دام فریب وغیرہ لیکن اس میں ایک خاص مناسبت ہونا چاہئے۔ دام محبت، ساغر محرومی ٹھیک نہیں ہے

(۳) جمادات کو ناطق تسلیم کرکے درخت پتھر زمین آسمان وغیرہ سے خطاب کرنا۔ ع "اے گل بتو خرسندم تو بوے کسی داری" ۔۔۔ یہ محاکات غیر مقبول پر بھی نظر کیجئے:

(۱) کسی موجود شے کو ایک غیر ممکن و ممتنع الوجود سے تشبیہ دینا محاکات کی بے اعتدالی ہے لیکن وہ محاکات جو غلو کاذب میں سوء خطائی شعرا کرتے ہیں مقبول محاکات ہے مثلاً ؎

در عدم ہم ز عشق شورے ہست — گل گریباں دریدہ می آید

(۲) ایسی سادہ واقعہ نگاری جو صرف یقین و تصدیق کا فایدہ دیتی ہے محاکاۃ غیر مقبول ہے البتہ اگر معانی شعریہ اس میں شامل ہوں تو وہ مستحسن ہے۔ اسی وجہ سے قصص و فتوحات شاعرانہ داخل شعر ہیں اور محض تاریخ شعر سے خارج ہے۔

(۳) اصل شے میں تحریف پیدا کرنا مثلاً دوکان کے بجائے کسی کے تین کان ثابت کرنا۔ محاکاۃ نامقبول ہے۔ اسی طرح ایسے الفاظ میں محاکاۃ کرنا جو محتمل الضدین ہوں۔ یعنی دو معنی ایسے ہوں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں مدح اور ذم دونوں پر دلالت ہو۔ مثلاً کیوان (زحل) نحس ستارہ ہے لیکن اوج و رفعت میں بھی ضرب المثل ہے۔

چونکہ تخئیل ہر محاکاۃ کو لازم ہے اس لئے تخئیل کے متعلق حسن و قبح کی کوئی بحث نہیں ہوسکتی۔ نقل پر اصل کا گمان ہونا بلکہ نقل کو اصل کی طرح مخاطب کے ذہن میں اُتار دینا اور اس کو اصل باور کرانا تخئیل ہے اور سامع کا فریب میں آکر نقل کو اصل سمجھنا اور اس سے متاثر ہونا تخئیل کی قوت کا نتیجہ ہے اسی کو تاثیر شعر کہتے ہیں۔

مُمتاز سہسوانی

محمودی رسمِ خط

(محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم۔اے کے تبصرے کا جواب)

مارچ ۱۹۴۱ء کے نگار میں مولوی محمود علی خاں صاحب نے اُردو رسم خط پر "صوا گفتگو" کرتے ہوئے، اپنا ایجاد کیا ہوا ایک نیا رسم خط پیش کیا تھا جس پر ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۱ء کے نگار میں جناب محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم۔اے کا ایک اختلافی تبصرہ شایع ہوا۔ اب مولوی محمود علی خاں صاحب نے ان اعتراضات سے بحث کی ہے جو شروانی صاحب کی طرف سے انکے رسم خط پر وارد کئے گئے ہیں۔

اُردو رسم خط کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ ہے، لیکن افسوس ہے کہ لوگ اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ ایک زمانہ آنے والا ہے جب اُردو داں طبقہ مجبور ہوگا کہ وہ موجودہ رسم خط کو بدلے لیکن شاید یہ زمانہ وہ ہوگا جب وقت گزر چکا ہوگا۔

ضرورت ہے کہ اُردو داں طبقہ کے تمام اہل فکر و بصیرت اس طرف توجہ کریں اور اگر انھیں محمودی رسم خط میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اسے ظاہر کریں۔ یہ خالص علمی مسئلہ ہے جو آپس کی بحث و گفتگو ہی کے بعد خوش اسلوبی سے طے ہو سکتا ہے اور جس میں ذاتیات کو دخل دینے کی مطلق ضرورت نہیں۔

نیاز

ستمبر ۱۹۴۱ء اور اکتوبر ۱۹۴۱ء کے رسالہ نگار میں محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم۔اے کے مضمون کی دو قسطیں میری نظر سے گزریں، مضمون خاصہ طویل ہے اور بقول اڈیٹر نگار "فاضلانہ" بھی ہے، مگر بقول اڈیٹر موصوف "کاش اس کا انداز بیان زیادہ سلجھا ہوا ہوتا"، تو مجھے اس سے استفادہ کرنے کا اور زیادہ موقع ملتا، بہر حال مقالہ نگار کا فاضلانہ مضمون جس کے لکھنے میں اُنھوں نے بڑی کاوش کی ہے ضرور قابل داد ہے، خاصکر اس لحاظ سے کہ اُس کی وجہ سے اُردو رسم خط میں کسی مفید انقلاب کے پیدا ہونے کا خطرہ ہمیشہ کے لئے جاتا رہا، جزاک اللہ!

مجھے شریف صاحب سے یہ شکایت ضرور ہے کہ اُنھیں میرے ایجاد کئے ہوئے رسم خط میں کہیں بھی کوئی خوبی یا آسانی نظر نہیں آئی بلکہ اُن کی کوشش یہی رہی کہ اس پر جتنے زیادہ سے زیادہ اعتراضات ہو سکیں وہ کئے جائیں، چنانچہ انھوں نے رسم خط کے لفظ اور محمودی رسم خط کے نام ہی سے اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا، یہ اعتراضات بالکل اُسی قسم کے ہیں جس طرح کہ عربی قواعد کی ایک کتاب میں میری نظر سے گزرے۔

اعتراض — بداں گفت اِعلم چرا نہ گفت

جواب — زیرا کہ کتاب بہ فارسی است

اعتراض — باز اسعدک اللہ تعالیٰ چرا گفت

جواب — زیرا کہ دعا بہ عربی مستجاب است

مصنف نے کتاب کی ابتدا اس عبارت سے کی تھی "بداں اسعدک اللہ تعالیٰ" غریب بس اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ حاشیے پر سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی، اسی طرح سرسید مرحوم نے جب قرآن شریف کی تفسیر لکھی تو ایک مولوی صاحب نے ابتدا ہی سے اعتراضات کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے لکھا کہ سرسید نے سلف صالحین کے خلاف بسم اللہ کا ترجمہ بامحاورہ اُردو میں لکھ دیا ہے حالانکہ ہمارے بزرگ یوں لکھتے ہوئے چلے آئے ہیں کہ "شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ کے جو ہے بڑا مہربان نہایت رحم والا"

مجھے ہندوستان کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی اکثریت پر افسوس ہے کہ اُن کا جمود اُن کو زندگی کے کسی شعبے میں بھی ایک انچ آگے بڑھنے نہیں دیتا، اور زیادہ تعجب تو اس بات پر ہے کہ ہر مفید تجویز کی مخالفت میں پرانے خیال کے علما سے زیادہ انگریزی داں طبقہ زیادہ پیش پیش نظر آتا ہے، دوسری چیزوں پر بحث کرنے کا تو یہ موقع نہیں، صرف رسم خط کے مسئلے کو لیجئے کہ وہ ایک عرصہ سے ان بزرگوں کا میدان کارزار بنا ہوا ہے، اور آج تک کسی مفید نتیجہ تک پہونچنے میں کامیابی نہیں ہوئی اور نہ آیندہ اس کی توقع ہے، دُنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی مگر یہ ہیں کہ ابھی تک لیتھو کے پتھر پر

سر مار رہے ہیں، دوسری طرف دیکھئے کہ محض ٹائپ کی آسانی کی وجہ سے ہندی مطبوعات کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اُس کے اثر سے ہندی زبان اور ہندو تہذیب روز افزوں ترقی پر ہے اور ہماری آنکھیں ان تمام چیزوں سے بند ہیں اور ابھی تک ہم نے یہی طے نہیں کیا ہے کہ نستعلیق ہی قایم رکھا جائے، نسخ اختیار کر لیا جائے، دیوناگری یا رومن میں اُردو لکھی جائے یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے۔ اور کوئی بات طے بھی کیونکر ہو جب کہ ہمارے اختلافات کا یہ عالم ہے کہ کبھی تو ص۔ ث۔ ظ اور ذ کے حذف کر دینے سے اسلام خطرے میں آجاتا ہے، کبھی رسم خط بدلنے سے ماضی سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے، کبھی ٹائپ کو رواج دینے سے یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ لیتھو پریس والوں کو بڑا نقصان پہونچے گا اور تمام کاتب بیکار ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

اِن تمام خطرات میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز خطرہ رشتۂ ماضی کے منقطع ہونے کا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک رسم الخط ہی وہ رشتہ ہے جو ہم سب کو خیر القرون سے ملا ہوا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور رشتہ کی ضرورت ہی نہیں، آلِ رسول، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے خلف الصدق ہونے کے لئے صرف رسم الخط ہی کافی ہے، حالانکہ ان کو یہی نہیں معلوم کہ جس خط میں صحابہ عربی لکھتے تھے وہ ہمارے مروجہ خط سے اس درجہ مختلف تھا کہ ہم اُس میں لکھی ہوئی عبارت ہرگز نہیں پڑھ سکتے، اس خط میں نہ نقطے تھے اور نہ دائرے جن کے حذف کر دینے کا ہمارے شریف صاحب کو بڑا صدمہ ہے۔

رسم خط ہی پر منحصر نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کسی ایک مسئلہ پر متفق ہونے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی اور اختلافات کی کثرت سے ذہنیت اس درجہ فاسد ہو چکی ہے کہ کسی قسم کی اصلاح اُسوقت تک ممکن نہیں جب تک کہ قدرت ایک ایسی ہستی کو پیدا نہ کر دے جو اپنی آہنی طاقت سے اِن تمام اختلافات کو کچل کر سب کو راہ راست پر لگا دے۔ دراصل ہمارے ہندوستان کو بھی ایک مصطفےٰ کمال کی ضرورت ہے جو ان کرم خوردہ دماغوں کے بوسیدہ خیالات کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی طاقت سے اصلاحات نافذ کر دے۔ ملک کو ایک انسان کی ضرورت ہے نہ کہ صدہا انسان نما حیوانات کی

"کز مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید"

ترکی میں جب رسم خط بدلنے کا خیال پیدا ہوا تو وہاں بھی قدیم ذہنیت نے مخالفت شروع کر دی، کچھ لوگوں نے "ماضی سے رشتہ منقطع ہونے"، "عالم اسلامی سے تعلق قایم نہ رہنے اور "آج تک کا کل ذخیرۂ کتب بیکار ہو جانے" کا خطرہ ظاہر کیا، بعض نے کہا کہ عربی الفاظ کو ترکی تلفظ کے مطابق لکھنا جائز نہیں کیونکہ ترکی کے صلح کو عربی کی حدود میں قدم رکھنے کا حق نہیں ہے"، علما نے بھی اسے ناجائز قرار دیا، اور سب سے بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ ث، ض، ظ اور ذ کے اُڑا دینے سے اسلام خطرے میں آگیا، اور ہمزہ وصل اور لام تعریف کے حذف کر دینے سے سیبویہ، ابن حاجب اور ملا جامی کی ارواحِ طیبہ کو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ پیدا ہوا، اور یہ تمام باتیں قربِ قیامت کی علامتیں سمجھی گئیں، مگر ہمارے مصطفےٰ کمال کی اُس نے کسی ایک احمق کی نہ سُنی اور ایک دم رسم خط کو بدل کر ترکی زبان کو رومن حروف میں لکھنے کا حکم دیدیا، اس انقلاب کے بعض اہم اور مفید نتائج یہ نکلے:

۱- ترکی زبان ترکی تلفظ کے عین مطابق لکھی جانے لگی، خواہ اصل ترکی کے الفاظ ہوں یا عربی اور فارسی وغیرہ سے مستعار لئے گئے ہوں اور اس طرح پر املا میں غلطی واقع ہونے کا امکان تقریباً نوے فیصدی باقی نہیں رہا۔

۲- کسی لفظ میں کوئی حرف صحیح یا حرف علت زائد نہیں لکھا جاتا بلکہ جو حرف بھی ہوتا ہے وہ اپنی مقررہ آواز دیتا ہے اور اس لحاظ سے ترکی کا موجودہ رسم خط انگریزی، جرمن اور فرنچ وغیرہ سے زیادہ مکمل اور باقاعدہ ہے۔

۳- اُردو کی طرح پہلے ترکی بھی بغیر زیر زبر اور پیش کے لکھی جاتی تھی اور نگاہ عادی ہو جانے کی وجہ سے تصویر دیکھ کر لفظ کی مجموعی عبارت صحیح پڑھ لی جاتی تھی لیکن رسم خط میں اس قسم کے بنیادی نقائص پائے جانے سے ایک مبتدی بچے، ایک بالغ انسان اور غیر اہل زبان کو اس کے سیکھنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی اور اشکالِ حروف کی کثرت اور س اور ص وغیرہ کا جھگڑا اس پر مزید تھا۔ انقلاب کے بعد یہ صورت باقی نہیں رہی، مبتدی ہو یا منتہی، اہل زبان ہو یا غیر اہل زبان، تھوڑی سی مشق کے بعد صحیح عبارت پڑھنے لگتا ہے۔

۴- قدیم رسم خط میں سادے زبر زیر اور پیش کی علامتیں تھیں اور وہ بھی اُردو کی طرح عام طور پر نہیں لگائی جاتی تھیں، چونکہ ترکی زبان میں حرکات کی مرکب آوازیں بھی ہیں اسلئے مشکل الفاظ پر زبر زیر اور پیش لگا دینے کے باوجود اُن کا صحیح پڑھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن اب یہ کمی پوری کر دی گئی۔ ہر لفظ حروف علت کے ساتھ جو حرکات کا کام دیتے ہیں لکھا جاتا ہے، اور مفرد و مرکب آوازوں کے ظاہر کرنے کے لئے رومن حروف علت کسی علامت یا بغیر کسی علامت کے اس طرح لکھے جاتے ہیں:

(a) فتحہ اور الف ā ، ı ، ă ، o ، e ، ī ، ı ، â ، a

(â) کھنچے ہوئے الف، بغیر نقطے والی (ı) کرۂ معروف (i) یائے معروف ذرا کھنچی ہوئی۔ (e) زبر اور زیر کی درمیانی آواز (o) واؤ مجہول اور ضمۂ مجہول (ă) ضمۂ مجہول مائل بیائے مجہول، (u) ضمۂ معروف اور واؤ معروف (ū) ضمۂ معروف مائل بیائے معروف کا کام دیتا ہے۔

ج کی آواز کے لئے C چ کے لئے Ç اور ش کے لئے Ş اور ژ کے لئے J س، ص، ث کی جگہ مرت S ز، ذ، ظ اور ض کی جگہ Z ت، ط کی جگہ T ق اور ک کی جگہ K رکھا گیا، خ کا تلفظ موجودہ ترکی میں نہیں ہے اس لئے ہ، ح، خ کی جگہ مرت H سے کام لیا گیا۔ اس رسم خط کی علامات زیادہ تر ہنگری رسم خط سے اخذ کی گئی ہیں۔

ذیل میں ہم مثال کے طور پر چند عربی اور فارسی الفاظ ترکی اخبارات سے نقل کر کے لکھتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ترکوں نے اپنے تلفظ اور کتابت کو کس طرح مطابق کر دیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اب بھی ترکی میں عربی الفاظ کس کثرت سے استعمال ہوتے ہیں:

مخابر	muhabir	مدبش	müthiş	حکومت	hukümet
اہمیت	ehemmiyet	بلدیہ	belediye	مساعدہ	müsaade
منازعہ فیہ	münaziünfih	تشبث	teşebbüs	تضاد	tezat
چونکہ	çünkü	خیلے	hayli	ہنوز	henüz

میں نے اس موقعہ پر ترکی رسم خط کے متعلق بظاہر کچھ غیر ضروری تفصیل سے کام لیا ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو محمد شریف خاں صاحب شروانی کے بہت سے اعتراضات اس تفصیل کو پڑھ لینے کے بعد خود بخود رفع ہو جاتے ہیں، کیونکہ ایک طرف تو فاضل معترض نے لفظی اعتراضات ہیں اور دوسری طرف مصطفےٰ کمال کے تاریخی کارنامے کے عملی نتائج۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

اب میں اصل موضوع کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کے موجودہ رسم خط میں اصلاح کی ضرورت ہے، خواہ موجودہ حروف اور اُن کی شکلوں میں کچھ اصلاحی تغیر کر دیا جائے، خواہ کوئی دوسرا رسم خط اختیار کیا جائے، دیوناگری حروف کا اختیار کرنا تو میرے نزدیک خودکشی کا مترادف ہے۔ رومن حروف کے اختیار کرنے میں اگرچہ یہ فایدہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی ہر وہ قوم جو رومن حروف سے آشنا ہے مجبوراً اردو پڑھنے لگے گی اور اس طرح پر اردو کی اشاعت بڑھ جائے گی، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے مخصوص حالات کی بنا پر اس میں بڑی مشکلات پیش آئیں گی، لہٰذا بہتر صورت یہی ہے کہ موجودہ رسم خط ہی میں ایسی اصلاح کر دی جائے کہ وہ آسانی کے اعتبار سے کسی طرح رومن اور ہندی سے کم نہ ہو، اس صورت میں چیز بھی اپنی رہے گی اور رشتۂ ماضی بھی منقطع نہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے یہی آخری صورت اختیار کی اور ایسا رسم خط ایجاد کر کے پیش کر دیا جس میں نہ تو نئے سرے سے حروف شناسی کی ضرورت ہے اور نہ اُس میں ترکیبی مشکلات اور اشکال کی کثرت ہے، اور سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ حرکات جزو حروف ہو جانے سے غلط پڑھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اب رہے اعتراضات تو دُنیا کی ہر چیز پر روا اعتراض ہو سکتے ہیں اور اُن کے صدہا جوابات بھی دئے جا سکتے ہیں۔

محمد شریف خاں صاحب شروانی نے جو اعتراضات کئے ہیں اُن کے جوابات نہایت تفصیل سے دئے جا سکتے ہیں لیکن میں اس کو غیر ضروری سمجھتا ہوں اور صرف مختصر جوابات لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسم خط اگرچہ حقیقت میں "وہ معین حروف ہیں جن میں تصرف کرنے سے اس کی کتابت غلط ہو جاتی ہے"، لیکن اب عام طور پر اُردو میں "وضع کتابت" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اصطلاح پر جھگڑنا بے معنی ہے۔

میرے ایجاد کردہ رسم خط کا "خط رقومی" نام رکھنا فاضل معترض کے "حدود اختیار" سے باہر ہے اس کا نام محمودی رسم خط ہے اور یہی رہے گا۔

میں نے لکھا تھا (۱) اُردو حروف کا پیچیدہ اختلاف (۲) خط کی ترکیبی صورت (۳) حرکات کا محض سیاق عبارت سے پڑھا جانا، موجودہ رسم خط کے خاص خاص نقائص ہیں، انکے علاوہ اور بھی نقائص ہیں جن کو میں نے "وغیرہ وغیرہ" کے لفظ سے تعبیر کیا تھا۔ اس پر شریف صاحب لکھتے ہیں "وغیرہ وغیرہ سے جو نقائص مراد ہیں وہ تو سوچنے سے ذہن میں نہیں آتے"، شریف صاحب اگر ذرا غور سے کام لیتے اور ذرا زیادہ سوچتے تو اور نقائص بھی اُن کے ذہن میں آجاتے، مثلاً (۴) نستعلیق کے باریک جوڑوں کا تھوڑے عرصے کے بعد ٹائپ میں ٹوٹ جانا۔ (۵) حرفوں کا ایک دوسرے پر سوار ہونا، اور یہی دو ایسی خرابیاں ہیں جو اس خط کو ٹائپ میں منتقل ہونے سے مانع ہیں، اور اسی بنا پر حیدر آباد کا بنایا ہوا نستعلیق کا ٹائپ باوجود لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے کامیاب نہ ہو سکا۔

شریف صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "اس میں عقل کام نہیں کرتی کہ حرکات کے قیاس اور سیاق عبارت سے پڑھے جانے کو خط کے ٹائپ منتقل ہونے سے کیا لگاؤ ہے"، شریف صاحب کو یہاں یا تو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے یا انھوں نے دیدہ و دانستہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے، میرے مضمون کی عبارت یہ ہے: "اشکال کا پیچیدہ اختلاف اور اُن کی کثرت، خط کی ترکیبی صورت، یہ ایسی مشکلات ہیں جن کی وجہ سے ان کی موجودہ صورت ٹائپ میں منتقل نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کو بغیر پوری مہارت کے صحیح پڑھ سکتے ہیں، بچوں کے پڑھانے میں زیادہ

وقت صرف ہوتا ہے، غیر زبان والے اُسے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتے.....؟" اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ میں نے حرکات کے قیاس اور سیاق عبارت سے پڑھے جانے کو صرف ٹائپ میں منتقل نہ ہونے کا سبب قرار دیا ہے یا ایک طرف چند اسباب اور ایک طرف اُن کے نتائج لکھ دیئے ہیں۔

شریف صاحب فرماتے ہیں، "خط نسخ میں بھی وہی پیچیدہ و کثیر اشکال ہیں لیکن اس کا ٹائپ اندرون و بیرون ہند کام دے رہا ہے ان باتوں کے ہوتے ہوئے دلائل پیش کرنا بدیہیات سے انکار ہے" مجھے افسوس ہے کہ شریف صاحب نے میری عبارت غور سے نہیں پڑھی میرا یہ دعویٰ صرف نستعلیق سے متعلق ہے کہ وہ ٹائپ میں منتقل نہیں ہو سکتا، اور یہ بجائے خود درست ہے، اور اس سے انکار کرنا البتہ بدیہیات سے انکار ہے، رہا نسخ تو اس کے متعلق میں نے اپنے مضمون میں کچھ نہیں لکھا، لیکن اب یہ کہتا ہوں کہ نسخ اگرچہ ٹائپ میں منتقل ہو گیا ہے مگر اُس میں دوسرے نقائص بدستور پائے جاتے ہیں، یعنی اشکال کی کثرت اور عبارت کا سیاق کلام سے صحیح پڑھنا۔ مکمل رسم خط وہی ہے کہ جس زبان کا وہ رسم خط ہو اس کی تمام آوازوں کے لئے اُس میں علامتیں موجود ہوں اُس میں زیر زبر پیش کو علٰحدہ سے لگانے کی ضرورت نہ ہو اور جہاں تک ہو سکے حرف تہجی کی شکلیں کم سے کم اور ایک دوسرے سے واضح طور پر ممتاز ہوں ورنہ کثرت اشکال کی اگر پروا نہ کیجائے تو پھر چینی خط پر کیوں اعتراض ہوتا ہے جس میں سرے سے حروف تہجی ہی نہیں بالکل ہر چیز اور ہر مفہوم کے لئے ایک علٰحدہ شکل ہے، اور ٹائپ تو اُس کا بھی بن گیا ہے۔

حیدرآباد کے بعض "اہل ہمت کے مساعی" یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں "ایک صاحب" کے اعلان کرنے سے اگر کوئی عملی نتیجہ برآمد ہوتا تو اُسے "منصۂ ظہور" پر آجانا چاہئے تھا، کیونکہ کوئی مفید چیز بغیر رواج پائے نہیں رہ سکتی، مگر ایسا ہوا نہیں، اور مشکل بدستور باقی ہے۔

آگے چل کر معترض صاحب فرماتے ہیں: "اگر نستعلیق کے رواج سے ہمیشہ کے لئے مایوسی ہو چکی ہے تو اُس سے قریب تر خط نسخ ہے یا یہ خط رقومی (رسم خط محمودی)" شریف صاحب یہ تو واقعہ ہے کہ نستعلیق کے رواج سے ہمیشہ کے لئے مایوسی ہے، اب رہی یہ بات کہ نسخ کو اختیار کیا جائے یا کسی جدید رسم خط کو تو اس کا فیصلہ مستقبل خود کر دے گا۔

ستبدی لک الایام ما کنت جاہلا ویاتیک بالاخبار من لم تزود۔	عنقریب زمانہ وہ (چیزیں) تمہارے سامنے پیش کر دے گا جن کو تم نہیں جانتے۔ اور تمہارے پاس خبریں لیکر وہ (قاصد یعنی زمانہ) آئیگا جس کو تم نے زاد سفر نہیں دیا ہے۔

میں نے لکھا تھا کہ "بالغوں کی تعلیم اس خط کے ذریعہ سے تو کسی طرح ممکن نہیں"، فاضل معترض فرماتے ہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ "اس کے ذریعہ سے ان کی تعلیم ہو رہی ہے"! ممکن کے لفظ سے میرا مطلب امکان منطقی نہیں ہے۔ اس لئے کہ موجودہ رسم خط سے بھی زیادہ مشکل اگر کوئی رسم خط ہو تو اُس کے ذریعے سے بھی بالغوں کی تعلیم ہو سکتی ہے مگر سوال تو دشواری اور آسانی کا ہے۔ جس کا جواب آگے چل کر معترض صاحب خود دے دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اس کا الزام اصل خط پر عائد نہیں ہوتا، اس کی مستعمل صورت پر ہوتا ہے"۔

بندہ نواز! یہی تو میں کہتا ہوں کہ اصل حروف کی شکلیں قایم رکھی جائیں اور مستعمل صورت بدل دیجائے، بجائے ترکیبی صورت قایم رکھنے کے حروف الگ الگ کر دیئے جائیں اور حرکات کو حروف کا جزو بنا دیا جائے جیسا کہ محمودی رسم خط میں کیا گیا ہے۔

شریف صاحب فرماتے ہیں کہ "اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کے ڈھالنے میں تقریباً اتنی ہی سہولت ہوگی جتنی رقوم حسابی کے ڈھالنے میں، اور ٹکڑوں کی تعداد بھی خاص طور پر کم رہیگی" شریف صاحب کو محمودی رسم خط میں صرف یہی ایک آسانی نظر آئی اگرچہ اُس کو بھی "تقریباً" کا لفظ بڑھا دینے سے اُنھوں نے کچھ مشکل کر دیا، خدا کا شکر ہے کہ وہ ایک آسانی کے تو قائل ہوئے مگر اسی سلسلۂ عبارت میں تحریر فرماتے ہیں:

"لیکن اس نفع سے زیادہ نقصان ہے،

۱- حسن خط تو بالکل مفقود ہو جائے گا،

۲- پڑھنے کی آسانی گھٹ جائے گی"

شریف صاحب! اگر حُسن خط کے یہی معنی ہیں کہ ایک خوشنویس اطمینان سے بیٹھ کر نوک پلک سے درست ایک قطعہ یا ایک عبارت زیب دیوار کرنے کے لئے لکھدے، تو اس کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں، لیکن یہاں تو رونا یہ ہے کہ اگر کاتب صاحب کو اچھا ناشتہ مل گیا اور بیوی اُن کی سے لڑائی نہیں ہوئی تو انھوں نے ایک آدھ صفحہ ذرا اچھا لکھدیا، اور اگر بھوکے آگئے، بیوی سے لڑے یا تنخواہ وقت پر نہیں ملی تو جیسا بنا دیسا گھسیٹ دیا اور اگر بیمار پڑ گئے، یا نوکری چھوڑ کر چلدئے تو اُن کے قائم مقام نے اپنے مخصوص انداز میں دوسری طرح لکھنا شروع کر دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ حُسن خط کا وہی معیار ہو جو جناب کی نظروں میں ہے۔ پھر یہ رائے کس بنا پر قایم کر لی گئی کہ محمودی رسم خط حسین نہیں ہے حالانکہ آپ نے اُس کا سب سے پہلا نمونہ اردو بھی نستعلیق کے کاتب کا لکھا ہوا ملاحظہ فرمایا ہے، جس کی کرسی تک درست نہیں، یہ تو ایسا ہی ہوا کہ آپ ایک شخص سے دس حروف آڑے ٹیڑھے قلم سے لکھوا لیں پھر یہ فرمائیں کہ دس حروف میں حُسن نہیں پایا جاتا، ماشاء اللہ کیا طریقۂ استدلال ہے۔

آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "پڑھنے کی آسانی گھٹ جائے گی" یہ اعتراض تو سراسر غلط ہے، خط کے حروف مرکب کرنے یا مفرد رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ تجربہ تو اس کے خلاف شہادت دیتا ہے، انگلستان میں اس کے متعلق عملی تجربے کئے گئے۔ ایک اسکول میں ابتدا سے بچوں کو بجائے انگریزی کے مرکب خط تحریر کے رومن کے علیحدہ علیحدہ حروف کے ذریعہ لکھنے پڑھنے کی مشق کرائی گئی، پھر مقابلہ میں دیکھا گیا تو وہ مرکب حروف لکھنے والوں سے زیادہ تیزی سے لکھنے اور پڑھنے کے قابل ثابت ہوئے۔

بات یہ ہے کہ خط کے حروف مفرد ہوں یا مرکب الفاظ تصویروں کا کام دیتے ہیں، اور نظریں عادی ہو جانے سے اُن کی مجموعی صورت پر نظر پڑتی ہے اور فوراً انسان لفظ کو پڑھ لیتا ہے لہذا یہ خصوصیت صرف آپ کے مرکب خط کی نہیں ہے، لمبے سے لمبے انگریزی لفظ کی تصویر بار بار پڑھنے سے ذہن میں جم جاتی ہے اور اُس کو انسان آسانی سے پڑھ لیتا ہے، اور اگر آپ کا ایمان راسخ یہی ہے کہ مرکب نسخ یا نستعلیق میں پڑھنے کی آسانی زیادہ ہے تو پھر آیئے انگریزی بھی اس خط میں لکھنا شروع کر دیں اور انگریزوں کو بھی یہی مشورہ دیں۔

شریف صاحب کو محمودی رسم خط میں دائروں کے حذف کرنے پر بڑا غصہ آیا ہے اور وہ فرماتے ہیں "موجودہ خط کے مقابلے میں یہ جدت بہت بھونڈی ہے..... دائرے اور کشش کے ساتھ حرف ہمیشہ لفظ کے آخر میں آتا ہے، اور یہ ہمیشہ اُس کے اختتام کی خبر دیتے ہیں"

شریف صاحب معاف فرمائیں یہ جدت تو بھونڈی نہیں بلکہ جناب کا اعتراض نہایت بھونڈا ہے اس لئے کہ اگر ہر لفظ کے اختتام پر دائرے یا کشش کا وجود لازمی ہوتا تو یہ مصلحت بھی سمجھ میں آتی۔ اس کے علاوہ دنیا کے اور خطوں میں الفاظ کے آخر میں دائرے یا کشش کا وجود نہیں ہے لیکن پھر بھی الفاظ ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ چھوڑ دینے سے علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔ حروف کے ساتھ حرکات کو ملا کر اُن کا جزو لازمی قرار دینا ہی محمودی رسم خط کی سب سے بڑی خوبی ہے اور افسوس ہے کہ یہی فاضل محترم محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم اے کی سمجھ میں نہیں آئی، ارے صاحب یہی تو وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے عبارت کو غلط پڑھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ جب انسان ابتدا ہی سے حروف کو بشمول حرکات پہچان لے گا تو پھر غلط کیونکر پڑھ سکتا ہے، اب رہا یہ امر کہ موجودہ رسم خط میں علامات اعراب ہی کو قرآن شریف کی کتابت کی طرح کیوں نہ استعمال کریں، تو ایسا کرنے سے اول تو وہ مصلحت حاصل نہیں ہوتی کہ حروف اعراب کے ساتھ ایک بسیط شکل کی طرح ذہن میں نقش ہو جائیں، دوسرے عام طور پر ایسا کرنا ممکن یا کم از کم سہل العمل نہیں ہے اور اس میں اعراب کے غلط لگ جانے اور چھوٹ جانے کا احتمال بھی ہر وقت غالب رہتا ہے اور اسی طوالت کی وجہ سے عربی زبان جس میں اعراب کے بدل جانے سے معنے بھی بدل جاتے ہیں، عام طور پر بغیر اعراب کے لکھی جاتی ہے۔

ہمزہ وصل اور لام تعریف کے حذف کرنے یا قایم رکھنے کے متعلق میری رائے یہی ہے کہ اُردو کے جدید رسم خط میں وہی حروف لکھے جائیں جو بولے جاتے ہیں، اور اگر کوئی حرف بولنے سے حذف ہو جاتا ہے تو اُسے لکھنے سے بھی حذف کر دینا چاہئے، جیسا کہ ترکی کے موجودہ رسم خط میں کیا گیا ہے۔ اب رہا حرف تعریف کے معدوم ہو جانے کا ماتم تو اس کا حق آپ کو نہیں پہونچتا بلکہ عربوں کو پہونچتا ہے اور وہ بھی اُس صورت میں جبکہ عربی کا رسم خط زیر بحث ہو اور اُس میں حرف تعریف کو اُڑا دینے کی تجویز پیش کیجائے۔ اُردو زبان میں اُس کے قایم رکھنے یا حذف کر دینے سے عبارت کے مفہوم میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح کہ تس۔ تص اور ثہ کے یکساں تلفظ کرنے سے اُردو میں کوئی معنوی فرق نہیں ہوتا۔

واؤ مخلوط کے متعلق یہ کہنا ٹھیک ہے کہ بَوا اور ہَوا وغیرہ میں واؤ یقیناً مفتوح ہے لیکن ایسے الفاظ میں واؤ کا تلفظ نصف ہوتا ہے اور پہلے حرف کے ساتھ کچھ ملا ہوا سا معدوم ہوتا ہے، اس مناسبت سے اس کا نام واؤ مخلوط رکھا گیا نام رکھنے کے لئے تھوڑی سی مناسبت کافی ہوتی ہے، اس پر لڑنے کی کیا ضرورت ہے، آپ چاہیں تو اس واؤ کا نام آدھا واؤ رکھ سکتے ہیں، لیکن شریف صاحب کا یہ کہنا کہ دراصل یہ ہمزہ ہے بالکل غلط ہے اس لئے کہ ایسے الفاظ بولتے وقت ہمزہ کا تلفظ پیدا نہیں ہوتا۔ یہی حال یائے مخلوط کا ہے لہذا اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

ہائے مخلوط پر فاضل معترض نے اصطلاحات کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر بڑے زور شور کا حملہ کیا ہے، اس کے متعلق میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دراصل اُردو میں ہندی کی طرح ایک بھ اور ایک چھ، ایک پھ اور ایک چھ وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ شکلیں ہونی چاہئے تھیں لیکن محض اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے دو حرفوں کو ملا کر کام چلایا گیا ہے، اب رہی اس کے متعلق آپ کی علمی تحقیقات تو میں اس کو غیر ضروری خیال کرتا ہوں۔

شریف صاحب نے کسی موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ میں تو اس (محمودی رسم خط) کو نستعلیق کی مدد سے پڑھ سکا، گویا آپ کا نہ پڑھ سکنا اس بات کی قطعی دلیل ہو گئی کہ اس خط کے ذریعہ سے پڑھنا نستعلیق سے زیادہ مشکل ہے، واہ صاحب کیا بات کہی، جس رسم خط کو آپ نے پہلی مرتبہ دیکھا ہو، اور پھر اُس کے ساتھ آپ کو "ہمدردی" بھی نہ ہو اُس میں آپ آسانی سے پڑھ سکتے ہیں یا اُس خط کو جس سے آپ کی نظریں، اور آپ کا حافظہ عرصہ سے عادی ہو گیا ہے، سوال تو یہ ہے کہ محمودی رسم خط جس میں غلط پڑھنے کا امکان نہیں جس میں اعراب جزو حروف بنا دیئے گئے ہیں جس میں ہر حرف کی ایک ہی شکل ہے اور ہر حرف علیحدہ لکھا جاتا ہے اور حروف کے سر وہی ہیں جو موجودہ حروف کے ہیں، اصولاً اُس کو آسان ہونا چاہئے یا موجودہ رسم خط کو جس کے نقائص تفصیل سے اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ اب فاضل آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ جب نظریں اس خط سے عادی ہو جائیں گی تو موجودہ خط کے مقابلہ میں اس میں بہت زیادہ سہولت ہو گی

اور اہم خط کا مقصد یہی ہے۔

محمد شریف خاں صاحب کے مضمون کا سب سے زیادہ مہمل حصہ وہ ہے جو انھوں نے اُردو کی حرکات اور یائے معروف و مجہول اور واؤ معروف و مجہول اور یائے مخلوط کی تحقیقات کے لئے وقف کیا ہے حرکات کے متعلق وہ لکھتے ہیں:۔

"زبان اُردو کی حرکات پر اب تک کس نے توجہ نہیں کی قواعد کی سب کتابیں اس سے خالی ہیں اس سے جو کچھ میں بیان کروں گا وہ بالکل نئی بات ہے۔" پھر آگے چل کر زبر کی دو قسمیں فتحہ مستقیم اور فتحہ مائل، اور زیر اور پیش کی بھی دو دو قسمیں معروف و مجہول قرار دی ہیں، اس لئے اب بجائے تین کے چھ حرکتیں ہو گئیں، پھر آپ نے "زبان کی صحیح ترجمان کے لئے، ہر ایک کے علٰحدہ نام اور نشان" کی ضرورت محسوس کی ہے، اس ایجادِ بندہ کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ ایسی حرکتوں سے کیا فایدہ، اول تو ان کے تلفظ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے جس کے لئے نئی علامتیں مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئے اور اسی وجہ سے متقدمین نے بھی اس کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ زیر زبر اور پیش کی تین علٰحدہ علٰحدہ علامتیں لگانا ہی کیا کچھ کم طوالت نہیں ہے کہ اُس پر تین مزید غیر ضروری علامتوں کا اضافہ کیا جائے۔

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ "اس تقریر سے واضح ہے کہ معروف و مجہول واؤ اور یا کی اصطلاحیں سراسر لغو ہیں" میں کہتا ہوں کہ آپ اپنی تحقیق سے کچھ بھی ثابت کریں، فرق کمیت کا ہو یا کیفیت کا، معروف و مجہول کی آوازیں واؤ اور تی سے پہلے حرف کی حرکت کی کیفیت اور نوعیت پر منحصر مانی جائیں یا واؤ اور تی کے تلفظ میں معروف و مجہول کی مختلف آوازوں کا وجود سمجھا جائے، توجہ کے لحاظ سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا، واؤ اور تی معروف و مجہول کے فرقِ تلفظ کو ہر ایک محسوس کرتا ہے اور امتیاز کے لئے معروف و مجہول کی مختلف آوازوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ علامتیں رکھی گئی ہیں، یا صورت کا فرق قایم رکھا گیا ہے، اب اس مصیبت برپا کرنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر حقیقت میں یہ تنازع للبقاء کا کوئی اہم مسئلہ ہے تو وہ میرے موضوع میں کوئی خرابی نہیں ڈالتا، میں نے تو اُردو لکھنے کا ایک نیا طریقہ نکالا ہے اور جس طرح پہلے سے معروف و مجہول کی اصطلاحیں اور علامتیں پائی جاتی ہیں، میں نے اپنے رسم خط میں بھی اُن کے لئے علٰحدہ علٰحدہ نشانات رکھے ہیں۔

اس کے بعد شریف صاحب نے تازہ دم ہو کر یائے مخلوط اور ہائے مخلوط پر خامہ فرسائی فرمائی ہے اور اس ذیل میں خدا جانے کیا کیا لکھ گئے ہیں جو کہیں تو سمجھ میں آتا ہے اور کہیں نہیں آتا۔ اس بحث کے جوابات کی طرف میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں لہٰذا اب اس پر وقت ضایع کرنا وقت کا مجرمانہ اسراف ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں نے جو رسم خط پیش کیا ہے اس کے متعلق میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ اس میں اصلاح کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو وہ پوری نہیں کیجا سکتی، یا اس کے حروف کی شکلوں میں کسی قسم کے اصلاحی تغیر کرنے کی گنجایش نہیں، میں نے تو چند خاص اُصول کے پیشِ نظر یہ تجویز پیش کی ہے اور وہ اُصول میرے خیال میں بجائے خود صحیح اور درست ہیں، بلحاظ آسانی اور تکمیل کے اُردو کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا رسم خط نہیں ہو سکتا۔

محمود علی خاں بی۔اے

نگار کے پچھلے پرچے

۱۹۲۶ء: جنوری عہ۔ ۱۹۲۷ء: اگست عہ۔ ۱۹۲۸ء: مئی عہ۔ ۱۹۳۱ء: جولائی، اگست ۸ رنی پرچہ، ستمبر عہ۔ اکتوبر ۱۲ر نومبر دسمبر ۸ رنی پرچہ۔ ۱۹۳۲ء: جنوری عہ۔ فروری ۱۲ر۔ مارچ عہ۔ ۱۹۳۳ء: فروری عہ۔ ۱۹۳۴ء: فروری تا دسمبر عہ رنی پرچہ۔ ۱۹۳۶ء: دسمبر عہ رنی پرچہ۔ ۱۹۳۷ء: فروری عہ، مارچ تا اگست ۱۲ رنی پرچہ، اکتوبر عہ رنی پرچہ۔ ۱۹۳۸ء: فروری ۶ر۔ اپریل عہ۔ مئی تا دسمبر عہ رنی پرچہ ۱۹۳۹ء: فروری تا جولائی ۸ رنی پرچہ۔ اکتوبر، نومبر ۱۲ رنی پرچہ، اگست تا دسمبر عہ رنی پرچہ۔ ۱۹۴۰ء: فروری تا مئی ۶ رنی پرچہ جون ۱۲ رنی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۶ رنی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

شادی کی رسمیں اور اُنکی عمرانی اہمیت

شادی محض ایجاب وقبول کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی چند رسمیں ادا کرنا ضروری ہوتی ہیں جن کا سلسلہ ہر سوسائٹی میں قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ہر چند کہ یہ رسمیں تکمیل شادی کے لئے ناگزیر نہیں ہیں لیکن سوسائٹی کا زور اور دباؤ لوگوں کو اُن کی ادائگی پر مجبور کرتا ہے۔

عمرانی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے اِن رسوم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو تعلقاتِ صحیحہ کا علم ہو جائے۔ بقول مس برن کے اِن رسوم میں یہ شہرت ہی کا عنصر ہے جو جایز اور ناجائز رشتوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے اور اس کا اہتمام صرف مہذب ہی لوگوں میں نہیں ہے بلکہ غیر مہذب لوگ بھی اس کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ وہ قومیں جو تہذیب وتمدن سے پوری طرح آشنا نہیں ہیں اُن میں قبیلہ کا سب سے بڑا آدمی شادی (جائز جنسی تعلقات) کا اعلان کرتا ہے۔ مسلمانوں میں دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ رومیوں میں شادی کے وقت پورے دس گواہوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ٹیوٹانی ملکوں میں اب تک بعض بعض جگہ یہ رسم ہے کہ دولھا دلہن گواہوں کے سامنے ایک چادر کے اندر لیٹتے ہیں اور جب تک یہ منظر وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں شادی مکمل نہیں ہوتی۔ مشرقی افریقہ کی بنتو قوم میں دُولھا دُلہن کی 'پہلی خلوت' جلوت ہی ہوتی ہے۔ اور اِس موقع پر قبیلہ کی عورتوں اور لڑکیوں کی موجودگی ازبس ضروری سمجھی جاتی ہے۔ شادی کے موقع پر دعوتوں اور ضیافتوں کا ایک مقصد (مسرت اور اتحاد سے قطع نظر) یہ بھی ہے کہ اس طرح شادی کا زیادہ سے زیادہ اعلان کیا جائے۔

شادی فریقین کے ایتلاف واتحاد کی مظہر ہے اسی وجہ سے بعض ملکوں میں دلہن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دیدیا جاتا ہے۔ بلغاریہ، پرتگال، پولستان اور ہندوستان کے بعض حصوں میں محض ہاتھ کے ملانے پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ دونوں ہاتھوں کو باندھ دیا جاتا ہے۔ یوپی کے بعض شہروں میں دونوں کے دامن میں گرہ لگا دیجاتی ہے۔ برطانوی مشرقی افریقہ میں دونوں کلائیوں پر کسی پودے کی ٹہنی باندھ دیجاتی ہے۔ شاید انگوٹھی کی رسم کا بھی ابتدائی مفہوم یہی ہوگا۔ عہد متوسط کے درمیان یورپ میں انگوٹھیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ جو بہت سے توہمات وابستہ ہیں وہ اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ یہ اتحاد کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اسکاچستان کے شمالی مشرقی اضلاع میں لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی عورت انگوٹھی کھودے گی تو وہ اپنے محبوب شوہر سے بھی محروم ہو جائے گی۔

ایک اور عام رسم دولھا دولھن کے ساتھ کھانے کی ہے جو مہذب اور غیر مہذب دونوں میں یکساں طور پر مروج ہے۔ ہندوستان اور یونان میں ایک ہی رکابی یا پتہ میں کھانے کی رسم بہت قدیم ہے ان مواقع پر یورپ میں بھی ایک ہی نیچے سے کھانے یا ایک ہی چیز میں شرکت کرنے یا ایک ہی پلیٹ میں شامل ہونے کی رسم اب تک جاری ہے۔ سوئیڈن میں بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر لڑکا لڑکی ساتھ کھالیں گے تو ان میں محبت پیدا ہو جائے گی۔ مسلمانوں میں بھی میاں بیوی کا ساتھ کھانا مستحسن ہے۔ کھانے کے علاوہ ساتھ پینے کی بھی رسم ہے۔ چین میں تعلقاتِ زناشوئی سے قبل دولھا دلھن شراب یا شہد پیتے ہیں اور اس کا قاعدہ یہ ہے کہ دونوں کے پیالے ایک سُرخ ڈوری سے باندھ دیے جاتے ہیں۔ دولھا اپنے پیالہ میں سے پینے کے بعد دلھن کو دیدیتا ہے اور دُلھن اپنا جھوٹا پیالہ دولھا کو دیدیتی ہے اور یہ عمل کئی بار دوہرایا جاتا ہے۔ جاپان میں یہ تبادلہ کی رسم نو مرتبہ ادا کی جاتی ہے۔ یہودیوں اور روس، اطالیہ، ناروے اور اسکاچستان کے باشندوں میں بھی ساتھ پینے کی رسم پائی جاتی ہے۔

بعض ملکوں میں شادی کے موقع پر انڈے، شیشہ کی چیزیں یا مٹی کے برتن توڑے جاتے ہیں۔ پروفیسر وسٹرمارک اور دوسرے محققین کا یہ خیال ہے اس سے زناف کی معصومیت مقصود ہوتی ہے۔ نیورمبرگ میں یہ قاعدہ ہے کہ دولھا دلہن جب موخر الذکر کے مکان سے رخصت ہوتے ہیں تو دولھا کے سر پر ایک پلیٹ توڑی جاتی ہے۔ سالفلڈ (Seafeld) میں دولھا شراب کے گلاس کو دوسرے کے پیچھے پھینک کر توڑ دیتا ہے۔ اگر یہ کسی اتفاق سے نہ ٹوٹے تو اسے بڑا برا خیال کیا جاتا ہے۔ جرمنی میں بھی بعض بعض جگہ یہ رسم موجود ہے وہاں چینی کے برتن دلہن کے مکان کے سامنے توڑے جاتے ہیں اور اُن کا جتنا بڑا ڈھیر ہوگا اتنی ہی یہ خوش نصیبی کی علامت سمجھی جائے گی۔ یہودیوں میں آج تک شادی کے موقع پر شیشے توڑے جاتے ہیں۔

متذکرۂ بالا رسم کے صحیح معنی آج تک نہیں معلوم ہو سکے لیکن بعض ملکوں کی رسمیں وسٹرمارک کے خیال کی تائید کرتی ہیں۔ سربی قوم میں یہ رسم ہے کہ خاندان کا بزرگ آدھی رات کے وقت دلہن دولھا کے کمرے میں پہونچا دیتا ہے اور کمرہ باہر سے بند کر دیتا ہے۔ اس کے بعد فریقین کے لئے جام صحت پی کر اسے دروازہ پر توڑ دیتا ہے جو اختتام دوشیزگی کا اعلان ہوتا ہے۔ پروفیسر وسٹرمارک کہتا ہے کہ وسط مراکش کے (Akkyrusi) لوگوں میں یہ قاعدہ ہے کہ دلھن اپنے نئے گھر کو گھوڑی پر سوار ہو کر جاتی ہے اور اپنے سامنے ایک بید کا ٹکڑا رکھتی ہے جلوس کے لوگ اس بید کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ جب میں نے دریافت کیا کہ تم لوگوں نے یہ کیوں کیا تو انھوں نے جواب دیا "اس لئے کہ دولھا کو بھی پہلی شب میں ایسی ہی فتحیابی نصیب ہو" شادی کے

موقعوں پر سُرخ رنگ کا استعمال بھی اسی غرض سے ہوتا ہے۔ کینٹن کے چینی مسہری سے سرخ کاغذ کی دھجیاں باندھ دیتے ہیں اور اُن پر اس قسم کا کوئی دعائیہ جملہ لکھ دیتے ہیں کہ "خدا کرے تمھارے ہزاروں بچے اور پوتے ہوں"۔ ہندوستان اور فرغستان میں عموماً عروسی کپڑے سُرخ ہوتے ہیں۔

عام طور پر شادی وہی کامیاب سمجھی جاتی ہے جس میں بچے پیدا ہوں اولاد نرینہ اور بھی خوش نصیبی کی علامت سمجھی جاتی ہے چنانچہ بعض رسمیں محض انھیں مقاصد کے لئے ادا کی جاتی ہیں۔ مراکش میں یہ قاعدہ ہے کہ دولھا کی ماں اپنے بیٹے کے پُرانے کپڑوں کی گٹھری اس طرح لے کر نکلتی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ ایک چھوٹے بچے کو کھلا رہی ہے یا کبھی کبھی دولہن کی ماں ایک پالنے میں لٹا دیجاتی ہے اور اسے بالکل اِس طرح ہلایا جاتا ہے جیسے ایک شیر خوار بچے کو ہلا کر سلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دلہن اپنی سسرال کو گھوڑی پر بیٹھ کر جاتی ہے۔ مادہ جانور کا انتخاب اس بات کی طرف کنایہ ہے کہ اُس کے بہت سے بچے ہوں اور اس کی گود ہمیشہ بھری رہے۔ کبھی کبھی دُلہن کے پیچھے ایک بچہ بٹھا دیا جاتا ہے اس سے اولاد نرینہ کی تمنا مقصود ہوتی ہے۔ سوئیڈن کے بعض حصّوں میں رخصتی سے ایک روز قبل دُلہن کے پاس ایک بچہ سلایا جاتا ہے تاکہ پہلوٹی کا بچہ لڑکا ہی ہو۔ قدیم ہندوستان میں بھی دُلہن کی سسرال میں قدم رکھتے ہی ایک بچہ بطور نیک شگون کے گود میں رکھدیا جاتا تھا۔

بعض ملکوں میں دولھا دلھن پر اناج یا پھل پھینکنے کا رواج ہے۔ قدیم یونان میں دلھن پر سسرال کے اندر کھجوریں اور انجیر وغیرہ کی بارش کی جاتی تھی۔ روم میں میں کسی گری دار میوہ کی بکھیر ہوتی تھی۔ فرانس کے بعض اضلاع میں گیہوں نچھاور کیا جاتا تھا۔ انگلستان میں بھی سترھویں صدی تک دولہن کے اوپر گیہوں برسائے جاتے تھے من ہارٹ (Mannhardt) لکھتا ہے کہ یہ رسمیں دراصل اسی تعلق کا پرتو ہیں جو انسان اور پھل، یا بیج پیدا کرنے والے پودوں کے درمیان پایا جاتا ہے یا نتیجہ ہیں اُس مماثلت کا جو نباتی اور بعض اعضائے جسمانی میں پائی جاتی ہے"۔ بعض محققین یہ کہتے ہیں کہ ان رسموں سے محض "بارآوری" مقصود ہے لیکن فی الحقیقت ان رسموں میں کئی مقاصد آکر اس طرح مل گئے ہیں کہ اُن کو الگ کرنا مشکل ہے۔ بعض وقت ان سے خوشحالی اور بارآوری مقصود ہوتی ہے اور بعض وقت دولہا یا دُلہن کو "نظرِ بد" سے بچانا اصل مدعا ہوتا ہے۔ ایک ہی ملک میں اِن رسموں کے مختلف سبب بتلائے جاتے ہیں۔ اس سے بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کا اصلی مقصد فراموش کیا جا چکا ہے اور بعد میں مختلف قسم کے معنے پہنا دئے گئے ہیں۔

بعض ملکوں میں شادی کے موقع پر انڈے کا بھی کسی نہ کسی طرح استعمال ضرور ہوتا ہے۔ مراکش کا یہودی دولہا، دُلہن پر کچا انڈا پھینکتا ہے اس سے ایک محقق کے نزدیک اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُس کی بیوی کو وضع حمل میں آسانی ہو"۔

روس کے یہودی دُلھن کے آگے صرف انڈا رکھ دیتے ہیں اور اس سے دعا یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ جس طرح مرغی کو انڈا دینے میں دشواری نہیں ہوتی ایسے ہی خدا اس کی منزل کو بھی آسان کرے۔ اس کے علاوہ انڈا کثرت اولاد کی نشانی ہے۔ سوئیڈن میں دُلہن کے قسمے کھلے رہتے ہیں تاکہ جس آسانی سے وہ جوتا اُتار سکتی ہے ایسے ہی ولادت میں بھی سہولت ہو۔

مرد نے عورت پر اپنا ذاتی تفوق قایم رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے چنانچہ بعض ملکوں میں اس قسم کی رسمیں ہیں جو اس جذبۂ حکمرانی کی غمازی کرتی ہیں۔ کردستیا میں دولہا، دلہن کے آہستہ آہستہ کے لگاتا ہے اور اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ آیندہ وہ حاکم ہے اور بیوی محکوم۔ روس میں دُلہن کا باپ ایک نیا کوڑا لیکر آہستہ آہستہ اسے مارتا ہے اور کہتا ہے کہ "میں نے تجھے آخری بار مارا ہے اب کبھی نہ ماروں گا" اس کے بعد وہ دولہا کو کوڑا دیکر اپنے اختیارات اُسے سونپ دیتا ہے۔ ہنگری کی سلاف قوم میں یہ دستور ہے کہ دولھا دُلھن کو تین دفعہ پیٹتا ہے اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ دُلہن اپنے پچھلے دوستوں کو بھول جائے اور آیندہ سے شوہر کو اپنا مالک اور آقا سمجھے۔

بعض رسمیں اس کشمکش کی آئینہ دار ہیں جو دولہا دُلہن کے درمیان ایک دوسرے پر غلبہ اور تسلط حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ جرمنی کے بعض علاقوں میں جب پادری دونوں فریق کے ہاتھ ملاتا ہے اسوقت دولھا دُلھن دونوں اپنا ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں بعض وقت یہ بات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ پادری مرد کا ہاتھ اوپر رکھ کر فیصلہ کر دیتا ہے۔ روس میں دولہا دُلہن دونوں کو، جام شراب پیش کیا جاتا ہے اور دونوں یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے چند قطرے دوسرے گلاس میں ڈالدیں۔ جو اس کوشش میں پہلے کامیاب ہو جاتا ہے وہی اُنکے عقیدہ کے مطابق ازدواجی زندگی میں بااثر اور بااختیار رہتا ہے۔ مراکش کے بعض اضلاع میں دُلہن مینڈھے پر (جو شوہر کا قایم مقام ہوتا ہے) سوار کی جاتی ہے اور وہ بیٹھنے سے قبل اسکے گلے میں ایک طوق یا ہار ڈالدیتی ہے جس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ شوہر مطیع و فرمانبردار رہے۔ اس کے بعد مینڈھے کو ذبح کیا جاتا ہے اور جب اس کی انتڑیاں نکال دیجاتی ہیں تو دلہن اس پر اپنا پیر رکھدیتی ہے۔ اس ملک میں یہ رسم بھی ہے کہ جب دولھا مجلسِ عروسی میں داخل ہوتا ہے تو دُلہن اُس پر اپنا سلیپر اُٹھا کر پھینکتی ہے اور کبھی کبھی اُسے باقاعدہ پیٹتی ہے اگر وہ فریاد کرنے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ بیوی کا غلام رہے گا۔ اسی قسم کی رسمیں ہندوستان کے بھی بعض حصوں میں پائی جاتی ہیں۔

دولھا دُلھن کو آسیب سے بچانے کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پہلے زمانہ کے لوگوں کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ ان دونوں کو نظر لگ سکتی ہے اور اُن پر بھوت پریت کا بھی اثر ہو سکتا ہے اسلئے بعض رسمیں ایسی وضع کی گئیں جن کا مقصد محض تحفظ ذاتی ہے۔ روس میں تمام دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان بند کر دئے جاتے ہیں تاکہ اُن پر جادو اور سحر کا اثر نہ ہو۔ شادی کے وقت

پر تو ہیں اور بندوقیں اسی مصلحت کی بنا پر چھوڑی جاتی ہیں بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بھوت پریت شور وغل اور آگ وغیرہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ مراکش میں دلہن جس جانور پر سوار ہو کر آتی اس کے سامنے بہت زور سے باجہ بجایا جاتا ہے اور دلہن کے آنے کے قریب توپیں داغی جاتی ہیں کہ وہ دھوئیں سے ڈھک جاتی ہے۔ کبھی کبھی خاص اُس کے کمرہ میں کوئی پٹاخہ چھوڑا جاتا ہے تاکہ وہ جن اور پری کے اثر سے پاک ہو جائے۔ سلاف قوم کے لوگ، جب دولہا دلہن خلوت میں ہوتے ہیں تو حجلۂ عروسی کے باہر خوب شور وغوغا کرتے ہیں۔ بعض قوموں کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواحِ خبیثہ لوہے سے ڈرتی ہیں اسلئے دولہا دلہن اپنے پاس لوہے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور رکھتے ہیں۔ عیسائی لوگوں میں کچھ دیر کے لئے دلہن کے اوپر تلواروں کی صلیب بنا دیجاتی ہے۔ پروفیسر وسٹرمارک کا خیال ہے کہ ان مواقع پر غسل کرنے اور مہندی لگانے کی رسمیں بھی حفظ اتقدم کے طور پر ادا کی جاتی ہیں اور انکا مقصد اصلی محض احتیاطی یا طہارتی ہے۔ پروفیسر موصوف کے نزدیک مہندی خیر و برکت کی نشانی ہے شادی کے موقعوں پر روشنی کا اہتمام بھی اُس کے نزدیک زیادہ تر اندھیرے وہم کی بنا پر ہوتا ہے۔ بھوت پریت روشنی سے ڈرتے ہیں اور تاریکی میں خوش رہتے ہیں۔ اُن کے ڈر سے تمام محفل کو بقعۂ نور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہندوؤں میں دولہا دلہن کے سر پر چراغ کو گھمایا جاتا ہے۔ چین میں دلہن تیز اور روشن آگ کو پھلانگتی ہے۔ جرمنی میں دلہن تین مرتبہ تیز آگ کے گرد طواف کرتی ہے۔ بعض یورپی ملکوں میں اسے کلیسا کے گرد گھمایا جاتا ہے۔ یہ سب رسمیں دافع آسیب خیال کی جاتی ہیں۔ من آلے کہتا ہے کہ دولہا دلہن کو پٹینے کی رسم بھی دراصل خراب اثرات سے پاک کرنے کی غرض سے ہی عمل میں آئی ہے تاکہ ارواحِ خبیثہ بچوں کے پیدا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ ارواحِ خبیثہ کو دھوکا دینے کے لئے دُلہن، دُولہا کا اور دولہا، دلہن کا لباس پہن لیتا ہے۔ تاتار لوگوں میں یہ رسم آج تک موجود ہے۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ کوس میں بھی اسی قسم کی رسم رائج تھی۔ اسپارٹا میں جب دلہن حجلۂ عروسی میں شوہر کا انتظار کرتی تھی تو اس کو مردانہ کپڑے اور جوتے پہنا دیے جاتے تھے۔ مراکش کے بعض دیہاتوں میں دلہن کے مونچھیں لگا دی جاتی ہیں۔ ڈنمارک کے بعض مواضعات میں دولہا دلہن ایک دوسرے کے کپڑے پہن کر آنکھ مچولی کی مشق کرتے ہیں۔

پروفیسر وسٹرمارک کہتا ہے کہ ان تمام رسموں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صرف بھوت پریت کو دھوکا دینے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ اور بھی مقاصد شامل ہوں۔ کرالے (Crawley) کا خیال یہ ہے کہ جانبین ایک دوسرے کا لباس جنسی ڈر اور خوف کم کرنے کی غرض سے پہن لیتے ہیں اس طرح وہ "من و تو" کا فرق مٹا کر منزلِ مباشرت کو آسان کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا ڈر کم و بیش دونوں فریق کو ہوتا ہے۔ بعض قوموں میں بھوت پریت کو دھوکا دینے کے لئے جھوٹ موٹ کی دلہن یا جھوٹے موٹے کا دولہا بنا دیا جاتا ہے۔ یہ رسم سلاف، ٹیوٹانی اور رومانی لوگوں میں رائج ہے۔ بوہیریا میں ایک ریش دار آدمی کو دلہن کے کپڑے پہنا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مصنوعی شادی کا بڑا رواج ہے۔ شمالی ہند میں پیڑوں سے شادی کی جاتی ہے اور اس سے مقصود عموماً آسیب یا "نظرِ بد" سے بچانا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایک گھڑے کو مرد کے کپڑے پہنا دیے جاتے ہیں۔ اور لڑکی کی شادی اس سے کر دیجاتی ہے۔ بعد میں یہی تمام رسمیں "اصلی" موقعہ پر بھی دہرائی جاتی ہیں۔ تبت میں جب دولہا رخصتی سے پہلے مسجد کو جاتا ہے تو اس کے دو ساتھی اُسی کے سے کپڑے پہنے رہتے ہیں اور دولہا اُن کے بیچ میں ہوتا ہے انگلستان کے بعض حصوں میں اسی قسم کی رسم دلہن کے لئے رائج ہے۔ اسکی ساتھ والیاں بالکل ویسا ہی لباس پہنتی ہیں کہ دلہن ہیں اور اُن میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ بعض جگہ ساتھ والوں کو بغیر بھیس بدلے ہی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ شٹ لینڈ میں دولہا کا ساتھی، دولہا کے ساتھ سوتا ہے۔ بعض قوموں میں دلہن کے ساتھی، شبِ زفاف میں بھی موجود رہتے ہیں۔

پروفیسر وسٹرمارک کہتا ہے کہ دُلہن کے چہرہ کو ڈھکنے کا آغاز بھی آسیب کے ڈر سے ہوا ہے۔ مراکش کے اطراف و جوانب میں خود دلہن کی نظر کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ اپنی آنکھ اُسوقت تک بند رکھتی ہے جب تک کہ دولہا کو نہ دیکھ لے۔ ہندوستانِ قدیم میں دولہا، دلہن کی "نگاہ فتنہ انگیز" سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ عہدِ عتیق میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دولہا دلہن پر آفت آسمان اور زمین دونوں طرف سے آسکتی ہے۔ اسی وجہ سے سلاف قوم میں دولہا اپنے سر کو ہر وقت ڈھکے رہتا ہے اور سریانی دلہنیں اپنی کلاہِ عروسی رات کو بھی نہیں اُتارتی ہیں غالباً اسی سبب سے بعض ملکوں میں خصوصاً ویلس، چین وغیرہ میں دلہن زمین پر پیر نہیں اُتارتی ہے اسے دولہا یا کوئی اور شخص گود میں لیکر پلنگ تک پہونچا دیتا ہے۔ موخر الذکر رسم میں ممکن ہے حجاب دوشیزگی کو بھی دخل ہو جو نئے گھر کے اندر چلنے میں مانع آتا ہے لیکن ویلس۔ اسکاٹ لینڈ اور چین کے بعض حصوں میں دلہن کا زمین پر قدم رکھنا قطعی طور پر منحوس سمجھا جاتا ہے۔ بعض قوموں میں دولہا دلہن کو آسیب سے نجات، خاموشی، کم خوراکی، فاقہ کشی یا کچھ دنوں کی "پرہیزگاری" سے ملسکتی ہے۔ جرمنی اور سوئزرلینڈ اور فرانس کے بعض اضلاع میں شادی کے بعد تین راتوں تک زفاف کی نوبت نہیں آتی۔ یورپی ملکوں میں اس رسم کی ترویج میں عیسائیت نے بھی مدد دی ہے لیکن یہ رسم قدیم ہے اور عیسائیت سے پہلے سے رائج ہے۔ اس "رسمِ اجتناب" کا ایک ابتدائی سبب جنسی حجاب بھی ہو سکتا ہے جو فریقین میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لیکن پروفیسر وسٹرمارک اسکی قوی تر وجہ توہم پرستی قرار دیتا ہے۔ اولڈن برگ کہتا ہے کہ "ویدک عہد میں لوگوں کو یہ ڈر تھا کہ ہم بستری کے وقت کہیں ارواحِ خبیثہ عورت کے جسم میں داخل نہ ہو جائیں اور اسے حاملہ نہ کر دیں لیکن یہ بے وقوف روحیں پرہیزگاری کے دام فریب میں آجاتی ہیں اور پھر اس جانب توجہ نہیں کرتیں۔"

یہ ہلکا سا رسمی خاکہ بڑی پرانی شکل ہے ہر ملک کی ازدواجی رسموں پر ایک مبسوط کتاب طیار ہو سکتی ہے لیکن اوپر کی چند سطروں میں مختصراً ان رسوم کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جن میں انسان کی زندگی کے خطوط خال نمایاں ہیں۔ یا جو اس کی مختلف کیفیات و جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ انسان کے عہدِ طفولیت میں، جبکہ اسکی دلچسپیاں محدود تھیں، یہ رسمیں بڑی اہم اور نشاط انگیز سمجھی جاتی تھیں لیکن مئی روشنی نے عہدِ ماضی کی بہت سی یادگاریں مٹا دی ہیں چنانچہ اسی طرح ترقی نے ان ازدواجی رسموں کو بھی دھندلا دیا ہے۔ یہ جہاں باقی ہیں وہاں بھی اُن پر نزع کی سی کیفیت طاری ہے اس لئے کہ موجودہ انسان کی گوناگوں زندگی اس درجہ وسیع، ہنگامہ خیز اور عقلیت پسند ہو گئی ہے کہ اسکے پاس ان چیزوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ نشاطِ زندگی کا سوال سوائے اسکے کہ اس نے پہلے سے زیادہ دلکش طریقے ایجاد کر لئے ہیں اور سستی اور خوش عیشی کا یہ عالم ہے کہ "کنارِ فلک و حکم بر ستارہ کنم" کی روایتیں حقیقت بنکر اسکے سامنے آگئی ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے

اب سے ساٹھ سال بعد

آنے والی نئی دُنیا!

آنے والی نئی دُنیا سائنس کی کن ترقیوں کی حامل ہوگی؟ ۱۹۴۲ء سے لیکر ۲۰۰۱ء تک فطرت کے کتنے نئے رازوں سے ہم واقف ہو چکے ہوں گے اور اس واقفیت کو ہم اپنی مادی اور ذہنی زندگی کی تعمیر میں کس حد تک استعمال کر چکے ہوں گے؟ یہ وہ سوال ہیں جن کے جواب کو معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

مستقبل جس کا خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے بہت زیادہ دور نہیں ہے اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان پیدا ہونے والے بہت سے انسان اس نئی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اگر عصر حاضر کے رجحانات اور محرکات کا تجزیہ کیا جائے تو مستقبل کے متعلق دو باتیں قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ سائنس کا استعمال ہماری تمدنی زندگی کی بہتری کے لئے ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ ۲۰۰۰ء کے بعد جو زندگی ہم بسر کریں گے اس کا تعلق جمہوری تنظیم سے ہوگا۔

اب تک سائنس کی تمام ترقی محض انفرادی کوششوں کا نتیجہ رہی ہے۔ حکومت نے ان کوششوں میں ارتباط پیدا کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس میں شک نہیں کہ حکومتوں نے تخریبی ایجادات کی ہمت افزائی ضرور کی ہے مگر ان ایجادات کی ہمت افزائی کو علمی ترقی نہیں کہا جا سکتا۔ دُنیا کے وہ تمام سائنسداں جو حریص استعماری سیاست سے الگ رہے ہیں اور جنہوں نے انسانی تخریب کے لئے اپنے ذہن و دماغ کو وقف کرنے سے انکار کیا، وہ ہمیشہ مصیبت و افلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ جرمنی سے عصر حاضر کے سب سے بڑے مفکر آئنسٹائن کا اخراج اس بیان کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اسوقت تک حکومت نے اپنی دولت انھیں کوششوں کے لئے وقف کی ہے جن کا مقصود ہمارے تمدن کی تخریب سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ حکومتوں نے سائنس کی ترقی کی کوئی ہمت افزائی نہیں کی بلکہ انھوں نے سائنس کی کوششوں کو برباد کرانے کے لئے خود سائنس کو استعمال کرنے کی ترکیب ضرور اختیار کی۔ مگر آنے والی سائنس کی نئی دنیا غالباً ایسی نہ ہوگی۔ کیونکہ اسکے خلاف سائنس کی دنیا میں احتجاج کی بنیاد شروع ہو گئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ حکومتوں کو ایک خاص محکمہ "وزارت مفکرین" کے نام سے قایم کرنا پڑے۔ اس وزارت کے اراکین وہ ہوں گے جو سائنس، صنعت اور ایجادات کی مختلف شاخوں کے ممتاز افراد ہوں گے۔ یہ وزارت اُن تمام افراد کی کوششوں میں جو اب تک ایک دوسرے سے بے تعلق رہ کر کام کرتے ہیں، ارتباط پیدا کرے گی اور اس طرح وقت و محنت کا بیکار استعمال ناممکن ہو جائے گا۔ موجدین کی سرکاری امداد بھی ہو سکے گی جو عصر حاضر میں صرف روس میں ممکن ہو سکی ہے اور امریکہ میں میلان انسٹیٹیوٹ نامی جماعت بھی اس سلسلہ میں ایک حد تک مصروف عمل ہے۔ اس ضمن میں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جماعتوں کی بقاء کا انحصار محض منظم ذہنی قوت پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنس کی ترقی کا یہ نیا نظام، انسانی حیات کو بہتر بنانے کا دوسرا نام ہوگا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، مستقبل کے نظام میں دو باتیں یقینی پائی جائیں گی۔ ایک یہ کہ سائنس کا استعمال حیات انسانی کی بہتری کے لئے ہوگا اور دوسرے یہ کہ تمدن انسانی کا تعلق جمہوری تنظیم سے ہو جائے گا۔ کیونکہ جس "وزارت مفکرین" کا ابھی ذکر کیا گیا ہے وہ اسی وقت کام کر سکے گی جب سیاسی طور پر ہم اپنے موجودہ نظام حکومت میں بنیادی تبدیلی کریں اسلئے ہماری آیندہ زندگی بلاشبہ ایک جمہوری تنظیم سے وابستہ ہوگی اور اس جمہوری تنظیم اور موجودہ پارلیمنٹری نظام حکومت میں بڑا فرق ہوگا۔ آج دنیا کے اُن تمام ممالک میں جہاں پارلیمنٹری نظام پوری طرح سے جاگزیں ہو چکا ہے، ہر بالغ رائے دے سکتا ہے اور پارلیمنٹ کے انتخاب میں کھڑا ہو سکتا ہے، گویا پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے علم اور تجربہ کی کوئی قید نہیں اور نہ صحیح نمایندگی کا معیار علمی ارتقاء سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے آج ایک شخص خود کو کسی خاص مفاد کا محافظ بتلا کر پارلیمنٹ کا ممبر بن جاتا ہے اور پھر اس منصب کو نہایت غلط طریقے سے استعمال کرتا ہے مگر آیندہ جو جمہوری تنظیم قایم ہوگی اس کی پارلیمنٹ کے اراکین مختلف پیشوں، شعبوں اور تحریکوں کے نمایندوں کی حیثیت سے منتخب ہوں گے اور ہر پیشہ کے لئے ایک خاص امتحان کا پاس کیا جانا لازمی قرار دیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ انتخابات بھی مختلف طبقوں کی تناسب آبادی کے لحاظ سے ہوں گے اور خاص مسئلہ میں رائے

دہندگان کی رائے معلوم کرنے کے لئے رائے دینے والوں کو بھی پارلیمنٹ میں طلب کیا جاسکے گا۔ بہرحال آنے والی نئی دنیا سائنس کی تنظیم اور نظام حکومت کے لحاظ سے بالکل دوسری چیز ہوگی لیکن چند چیزیں اس وقت کی بھی باقی رہیں گی کیونکہ وہ ہمارے تمدن کا جزو لاینفک بن چکی ہیں۔ ان چیزوں میں کتابیں اور سائکلیں شامل ہیں۔ طباعت کی حرفت میں کسی بہت بڑی تبدیلی کا امکان نہیں ہے اور نہ دنیا کے علمی ورثہ کو محفوظ رکھنے کا اس سے بہتر ذریعہ معلوم ہوسکتا ہے اس لئے کتابوں کا بدستور رہنا ظاہر ہے۔ اسی طرح بائیسکل میں بھی تفصیلی تبدیلیوں کے علاوہ کسی بنیادی تبدیلی کا امکان نہیں۔ موٹر کار کی موجودہ شکل البتہ باقی نہ رہے گی۔ اگر موٹر کار کو کسی اندرونی انجن کے ذریعہ چلانا ممکن ہوسکا تو وہ انجن بہت ہی مختصر ہوگا اور ڈیزل کے اصول سے چلے گا۔ کیونکہ پٹرول سے جو قوت پیدا ہوتی ہے اس کا ۸۰ فیصدی حصہ موجودہ انجنوں میں ضایع ہوجاتا ہے۔ ہلکے، چھوٹے مگر زیادہ طاقتور انجنوں کو ابھی سے پسند کیا جانے لگا ہے۔ مثال کے طور پر ہوائی جہازوں کے انجن کو لیجئے جو ہزاروں گھوڑوں کی طاقت رکھنے کے باوجود بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ ہمارے انجنیروں اور موجدوں نے کم سامان سے زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول ممکن بنا دیا ہے۔ دوسری خاص چیز یہ ہوگی کہ لاسلکی سے آواز کی طرح، طاقت کا نشر بھی عام ہوجائے گا۔ جب ریڈیو سیٹ فضا سے آواز حاصل کرسکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ موٹر کار بھی فضا سے نشر شدہ طاقت جذب کرنے کے بعد نہ چل سکے۔ بلاشبہ اس وقت تک فضا میں نشر شدہ طاقت کا حصول جرم ہے۔ چنانچہ ایک ریڈیو اسٹیشن سے نشر شدہ طاقت حاصل کرکے مکان میں روشنی کرنے کے الزام میں جرمنی اور انگلستان دونوں جگہوں بعض لوگوں کو سزائیں دی جاچکی ہیں۔ مگر یہ جرم کب تک جرم رہے گا اور کیا اس کا جرم رہنا ہماری آیندہ ترقی کے منافی نہ ہوگا؟ ایک ریڈیو اسٹیشن کے آلۂ نشر سے طاقت بہت ہی تھوڑی سی مقدار میں نشر ہوتی ہے مگر اس کے باوجود وہ محض ایک ملک یعنی انگلستان ہی میں ۳۰ لاکھ ریڈیو سیٹ چلا سکتی ہے اور اگر مقدارِ طاقت کا معین کرنے والا پیمانہ بلا کسی روک کے اپنی پوری قوت سے کھول دیا جائے تو یہ طاقت برتنوں کو اُلٹ دینے اور دروازوں کو بھڑ بھڑا دینے کے لئے کافی ہوگی۔ فضا میں طاقت کے بے شمار خزائن پوشیدہ ہیں۔ ہمیں اُن سے فایدہ اُٹھانا چاہئے۔ اس لئے "فضائی طاقت" کا استعمال لازمی ہوگا نہ صرف موٹر کاروں کو چلانے کے لئے بلکہ دوسرے کاموں کے لئے بھی۔

جس طرح فضا سے طاقت کا حصول ضروری ہوگا اسی طرح فضا میں طاقت کا نشر بھی انتہائی ضروری ہوگا۔ چنانچہ موجودہ صدی کے خاتمہ پر کوئلہ کانوں سے کھود کر طاقت کے مرکزوں اور اسٹیشنوں کو روانہ نہ کیا جائے گا بلکہ کانوں ہی میں کوئلہ کو طاقت میں تبدیل کردیا جائے گا اور وہیں سے (اس طاقت کو) استعمال ہونے والے مقامات پر پہونچا دیا جائے گا جیسے کہ آج پانی اور بجلی کو روانہ کیا جاتا ہے۔

بجلی کا استعمال بھی آیندہ بہت عام ہوجائے گا اور گیس کی جگہ لے لیگا۔ اسی طرح سے پانی کی فراہمی کا موجودہ طریقہ بھی بدل جائے گا۔ کیونکہ اس جنگ میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ دشمن کا ہوائی جہاز پانی کے ذخیروں کو اسی آسانی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے جیسے دریاؤں، نہروں وغیرہ کو اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ ملک کی آب رسانی کے پورے نقشہ سے واقف ہونے کے بعد دشمن اُس ملک کو بیدست و پا کرسکتا ہے لہذا آیندہ آبرسانی کے ذخایر سب زمین دوز ہوں گے۔ فن تعمیر بھی بنیادی طور پر بہت بدل جائے گا۔ ایک بڑی اینٹ پر دوسری چھوٹی اینٹ رکھنے کا وہ طریقہ جو اُس زمانہ سے رائج ہے جب حضرت سلیمان کے معابد اور بخت نصر کے شہر کی تعمیر ہوئی تھی، ترک ہوجائے گا۔ عمارتوں کے پورے پورے ڈھانچے کھڑے کردئے جائیں گے اور ان میں کنکریٹ پلا دیا جائیگا اور اس طرح ہر عمارت پہلے سے طے شدہ نقشے کے مطابق ڈھل سکے گی اور عمارتوں میں ایک مرکزی مقام سے حرارت پہونچائی جائے گی۔

ذرایع نقل و عمل بھی آیندہ بہت وسیع ہوجائیں گے۔ آج بھی بحر اوقیانوس ہوائی جہازوں سے روزانہ پار کیا جاتا ہے۔ آج بھی دُنیا بھر میں ہزاروں فضائی مستقر تعمیر ہوچکے ہیں اور موجودہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد یہ مستقر دُنیا کو فضائی راستہ سے ایک رشتہ سے وابستہ کردیں گے فضائی سفر سے وقت پر فتح حاصل ہورہی ہے۔ وقت پر فتح پانا، فاصلہ پر فتح پانے کے مرادف ہے۔ دُنیا کے مختلف مقامات کا فاصلہ اس طرح سے کم ہوتا چلا جارہا ہے اور جس آسانی کے ساتھ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ جاسکیں گے، وہاں کے لوگوں سے مل جل سکیں گے اتنی ہی زیادہ امن کی بنیاد پائدار ہوگی۔ فضائی سفر کے لئے موجودہ جنگ نے تربیت یافتہ ہوابازوں کی بہت بڑی تعداد مہیا کردی ہے۔ چنانچہ آج بھی دس میل بلندی پر جاکر جہاں تیز رفتاری کا حصول بہت زیادہ آسان ہوجاتا ہے، سفر کرنے کے لئے خاص طیاروں کی تعمیر شروع ہوگئی ہے۔ دس میل اوپر فضا کا حصہ (Stratosphere) کہلاتا ہے اور موجودہ صدی کے خاتمہ سے پہلے ہی ہمارا وہاں پہونچنا روز کا معمول ہوجائیگا۔ آیندہ بجلی سے چلنے والی ریلیں مسافروں کے لئے استعمال نہ ہوں گی بلکہ محض اسباب و سامان کے نقل و حمل کے لئے وقف ہوں گی، اس کے لئے سڑکوں کی تعمیر وغیرہ کے متعلق ایک خاص حکمت عملی کو اختیار کرنا پڑے گا جس میں "حفاظت" اور "سرعت" "رفتار" دونوں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ یعنی راستے ایسے ہوں گے جو رفتار میں اضافہ کا باعث بھی ہوں گے اور جان و مال کے نقصان کا بھی اُن پر کم اندیشہ ہوگا اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ بار برداری اور سواری کی گاڑیوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور موجودہ صدی کے ختم ہونے سے قبل تک ہر فرد کے پاس، کم از کم اُن ممالک میں جو عصر جدید کی تمدنی ترقیوں سے مالا مال ہوچکے ہیں، ایک ایک موٹر کار یقینی ہوگی۔ تفریحی شغل بھی اس اُصول سے نہیں بچ سکیں گے۔ چنانچہ ٹیلی وژن کے ذریعہ سے ہم دنیا کی چیزوں کو سننے کے علاوہ ہر ہر لمحہ دیکھ بھی سکیں گے۔ تمام سائنسداں فطری طاقت کے عظیم ترین خزینہ یعنی سورج سے حصول طاقت کے طریقوں کا برابر تجربہ کرتے رہے ہیں چنانچہ بہت ممکن ہے کہ آج سے پچاس برس بعد کوئی ایسا آلہ ایجاد ہوجائے جو کوئلہ کی کمی اور تیل کی فراہمی کے تمام مسائل کو حل کردے اور ہم سورج سے ساری طاقت حاصل کرلیا کریں۔ ہماری غذا بھی بدل جائے گی! حیاتین (Vitamins) اور پروٹین (Proteins) کے متعلق ہماری معلومات جوں جوں ترقی کرتی جائے گی، ثقیل اور بیکار غذاؤں کو ترک کرتے جائیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ ہم غذائی جوہروں کی گولیوں اور ٹکیوں کو کھا کر زندگی بسر کرنے لگیں اور ایک نئے حیاتی ارتقار (Biological evolution) کا دور شروع ہوجائے۔

پٹرول اور موجودہ تمدن

استنباط و صناعت کے طریقے اور طبعی و ماہیتی تحقیقات

پٹرولیم (پٹرول) لاطینی لفظ ہے جو (Petra) اور (Oleum) سے ماخوذ ہے اس کے معنی ہیں "پتھر کا تیل"۔ اسے پتھر کا تیل اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اکثر چٹانوں اور پتھروں کے بیچ میں پایا جاتا ہے اور عام تیلوں کی طرح ایک سیال مادہ ہے۔ اس کا علم آج سے نہیں بلکہ دُنیا کو اسوقت سے ہے جبکہ تاریخ نے آنکھ بھی نہیں کھولی تھی، قدیم مصری، چینی اور جاپانی اس سے واقف تھے مگر اس کی حقیقی معرفت اور اس سے عظیم الشان نفع اندوزی موجودہ عصر کے اکتشافات کا نتیجہ ہے۔ اسکو صاف کرنے کی ابتداء ۱۸۲۵ء میں سب سے پہلے باکو کے اندر ہوئی اور ولایات متحدہ امریکہ میں جہاں آج پٹرول سے بیشمار دولت حاصل کی جاتی ہے وہاں اس صناعت کی ابتدا ۱۸۵۹ء میں ہوئی جسے صرف ۸۱ سال ہوتے ہیں لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ موجودہ دور کا جدید ترین اکتشاف ہے مگر اس نے وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ اگر کوئی شے اپنی اہمیت و عظمت میں اس کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ لوہا ہے آج ہماری ضرورتوں میں اس کی حیثیت کا یہ حال ہے کہ اس کے بغیر دُنیا کا کوئی جھونپڑا بھی ایک رات چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتا اور اگر یہ نہ حاصل ہو سکے تو موٹروں، ہوائی جہازوں، انجنوں اور نہ معلوم کتنے آلات اور مشینوں کی ساری گردش و حرکت پل بھر میں ختم ہو جائے۔ آجکل تو پٹرول کا استعمال آہستہ آہستہ اور زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہوتا جا رہا ہے، ولایات متحدہ کے اکثر کارخانوں میں اب پٹرول ہی استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح روس کے ریلوے انجنوں میں کوئلہ کے بجائے پٹرول استعمال کرتے ہیں۔ پٹرول کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گزشتہ جنگ عظیم میں فرانس کے وزیر اعظم کلیمنسو نے ولسن پریذیڈنٹ جمہوریہ امریکہ سے، جب پٹرول کی درخواست کی تھی تو کہا تھا کہ "پٹرول کا ہر قطرہ قطرۂ خون کے برابر ہے"۔

پٹرولی منطقوں کا انکشاف

پٹرول کی زمینوں کا آسانی کے ساتھ پتہ لگا لینا بہت مشکل ہے یہ ایک سیال مادہ ہے اور کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا بلکہ ہمیشہ اِدھر اُدھر متحرک رہتا ہے، دوسرے یہ کہ کبھی تو یہ طبقات ارض کے جدید طبقوں میں پایا جاتا ہے اور کبھی پُرانے طبقوں میں اسی طرح کبھی جھاڑی دار ٹیلوں میں پایا جاتا ہے اور کبھی چٹیل میدانوں میں، جس کی وجہ سے اس کی زمینوں کا حقیقی اور قطعی علم حاصل کرنا بڑی حد تک ناممکن ہے۔

پٹرول میں شور پانی اور گیس کا بہت کافی میل ہوتا ہے اور شاید یہی دونوں اجزاء ہیں جو اسے سطح زمین تک لے آتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جہاں پٹرول نکلنے کی توقع ہوتی ہے تو وہاں محض شور پانی یا گیس نکلکر رہ جاتی ہے، اسی لئے پٹرول کی طلب ایک قسم کا جُوا ہے۔ چنانچہ بارہا دیکھا گیا کہ پٹرولی منطقوں کی جستجو، کنوؤں کی کھدائی اور طرح طرح کی مشقتیں اُٹھانے کے بعد ہاتھ نہ آیا۔

پٹرول کے کنویں کھودتے وقت پہلے برج ناجر ثقیل کے قسم کا ایک آلہ کھڑا کر لیا جاتا ہے جسے (Derrick) کہتے ہیں اس کی بلندی تقریباً ۷۰ قدم ہوتی ہے اس میں پہیے کی طرح کی ایک چیز لگی رہتی ہے جس پر سے ایک موٹی رسّی گزرتی ہے، اس رسّی کے ایک طرف سوراخ کرنے والا ایک زبردست فولادی آلہ بندھا رہتا ہے اور رسّی کا دوسرا حصّہ ایک دخانی انجن سے متصل ہوتا ہے جو اس کو برابر اُٹھاتا اور گراتا رہتا ہے۔ یونہی مسلسل کوششوں کے بعد جا کر کوئیں تیار ہوتے ہیں، بعض دفعہ تو ایسا بھی دیکھا گیا کہ زمینوں کی سختی اور تیل کے نچلے طبقوں میں ہونے کی وجہ سے اس کھودائی کا سلسلہ بہت طویل مدتوں تک جاری رہتا ہے اور کنوئیں بہت گہرے ہو جاتے ہیں چنانچہ مصری میدان کے کنوئیں ۲۸۰۰ فٹ گہرے ہیں، اور امریکہ کے میدانوں میں تو پٹرول .... ۱۰ فٹ کی گہرائی سے برآمد ہوتا ہے۔ اسی طرح یونان میں بھی پٹرول ۳۰۰۰ فٹ پر پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنی مسافت زمین کی گہرائی میں بہت زیادہ دہشت انگیز ہے۔

پٹرول کے چشمے

اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ پٹرول کی زمینوں میں تیز قسم کے گیس کا مادہ بہت کافی موجود ہوتا ہے اسی لئے بعض دفعہ پتھروں کو تراشتے وقت گیس کی قوت

سے بڑے بڑے چشمے اُبل پڑتے ہیں چنانچہ ۱۸۹۲ء میں باکو کے پٹرولی علاقہ کے اندر ایک بہت بڑا چشمہ پھوٹ نکلا تھا جس سے تیل اور ریت وغیرہ کے اجزاء بڑی تیزی کے ساتھ اوپر کو بلند ہوئے اور اسی کے ساتھ ایک عجیب و غریب اور خوفناک قسم کی آواز بھی پیدا ہوئی جو وہاں سے میلوں کی دوری پر سُنی گئی اس چشمے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اس کا فوارہ تقریباً ۲۰۰ فٹ کی بلندی تک پہونچتا تھا اور اس کی قوت سے برت ناآلہ (.....) بھی اکھڑ گیا تھا مگر چونکہ یہ کام ایک چھوٹی سی ارمنی کمپنی نے شروع کیا تھا اس لئے وہ تیل کے اس عظیم الشان خزانہ سے استفادہ نہ کر سکی۔

ایسا ہی ایک واقعہ مصر میں بھی ہوا تھا، وہاں بھی ۱۹۱۴ء میں ایک چشمہ اُبل پڑا تھا جس سے تقریباً چار سو ٹن روزانہ پٹرول خارج ہوتا تھا لیکن یہ سارا تیل راستے کے ٹیلوں کو طے کرتا ہوا بہکر بحر متوسط میں گر جاتا تھا۔ اس کے روکنے کے لئے بہت کوشش کی گئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

خام پٹرول خام پٹرول چونکہ لیس دار اور متعدد مواد کا امتزاج ہوتا ہے، اس لئے وہ روشنی کے استعمال کے قابل نہیں ہوتا اور اسے صرف ریلوے انجنوں اور جہازوں میں کبھی کبھی استعمال کرتے۔ بعض پٹرول تو سیاہ اور بہت زیادہ بھاری اور لیس دار ہوتا ہے اور بعض بیگنی رنگ کا قدرے سیال اور بنزین (Benzine) اور کیروسین (Kerosene) کا مجموعہ ہوتا ہے اور یہ اختلاف مختلف ممالک کی زمینوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ ایک کنوئیں میں بھی بلحاظ عمق یہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

پٹرول مختلف کیمیائی مرکبات سے مخلوط مانا جاتا ہے اور یہ مرکباتی اجزاء خود دو عنصر ہیڈروجن اور کاربن سے مرکب ہوتے ہیں جنھیں کیمیائی اصطلاح میں ہیڈروکاربنس (Hydrocarbons) کہتے ہیں مگر ان میں گندھک، نائٹروجن اور اوکسیجن کے اجزا بھی کچھ مقدار میں شامل ہوتے ہیں۔ پٹرول کو کیمیادی لحاظ سے تین درجوں میں تقسیم کرتے ہیں :

۱- وہ پٹرول جس کا بنیادی جزو پیرافین (Paraffin) ہوتا ہے اس میں اسفلٹ (Asphalt) کا حصہ کم ہوتا ہے اور ہائیڈروجن اور کاربن کے مرکبات بہت کافی حد تک موجود ہوتے ہیں، اس سے جو تیل نکلتا ہے وہ سب سے قیمتی تیل مانا جاتا ہے۔

۲- وہ پٹرول جس کا بنیادی جزو نفتھین ہوتا ہے۔

۳- وہ پٹرول جو مذکورۂ بالا دونوں اجزاء اصلیہ سے مخلوط ہوتا ہے۔

پٹرول کی صفائی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں خام پٹرول جبکہ وہ زمین سے نکالا جاتا ہے، استعمال کے قابل نہیں ہوتا اس لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اسے دوسری ترکیبوں اور مشینوں سے صاف کیا جائے اور بنزین اور کیروسین جیسے پٹرولی مواد کے اجزاء اصلیہ اور جوہر کو اور دوسرے مخلوط اجزاء سے الگ کر کے نکالا جائے۔

پٹرول کی صفائی کے کارخانے میدانوں سے دور سواحل پر تعمیر کئے جاتے ہیں، جہاں خام پٹرول نلوں کے ذریعہ پہونچایا جاتا ہے۔ یہ نل کنوؤں کے منہ پر لگے ہوتے ہیں۔ ان نلوں کی لمبائی کہیں میلوں تک پہونچ جاتی ہے چنانچہ مصری میدان کے نل ۱۵۰ کیلو میٹر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ولایات متحدہ کے میدانوں میں یہ نل ..... ۱ میل تک چلا گیا ہے جس سے روزانہ ..... ۱ پیپا (Barrel) تیل گزرتا ہے۔

پٹرول کے صاف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسے مخروطی شکل کے کنٹروں میں بھر لیتے ہیں جن میں ہر ایک ..... ۵ یا ..... ۶ گیلن کا ہوتا ہے۔ ان کنٹروں میں نالیاں لگی رہتی ہیں جن میں پٹرول کا جوہر گرم ہو کر بھاپ کی شکل میں منتقل ہونے لگتا ہے۔ یہ نالیاں آگے چلکر بہت زیادہ ٹھنڈے پانی سے گزرتی ہیں جہاں پہونچکر پٹرولی بھاپ سردی کی وجہ سے رقیق مادے کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس کے بعد یہ رقیق پٹرولی مادہ الگ الگ ڈبوں میں آگرتا ہے جہاں پھر اسے تیزاب اور کاسٹک سوڈا وغیرہ سے صاف کرتے ہیں۔

پٹرول کو جن مختلف درجات حرارت میں رقیق اور صاف کیا جاتا ہے ان درجوں کے اختلاف کے لحاظ سے پٹرول کی بھی مختلف قسمیں ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :

۱- ۴۰ اور ۷۰ ڈگری حرارت میں جو پٹرول صاف ہوتا ہے اس سے ایک بہت رقیق تیل نکلتا ہے جسے پٹرول کا جوہر کہتے ہیں، یہ جراحی اور سرجری وغیرہ کے کاموں میں اعضا کو شل کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۲- جو ۷۰ اور ۹۰ ڈگری حرارت میں صاف کیا جاتا ہے، اس سے گیسولین (Gesoline) نکلتا ہے۔

۳- جو ۸۰ اور ۱۲۰ ڈگری حرارت میں صاف کیا جاتا ہے اس سے بنزین (Benzine) خارج ہوتا ہے۔ گیسولین اور بنزین دونوں موٹروں اور ہوائی جہازوں کے انجنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ نیز ان سے گوند اور ربر گھلایا جاتا ہے۔

۴- جو ۱۲۰ اور ۱۵۰ ڈگری حرارت میں صاف کیا جاتا ہے، اس سے جو سیال مادہ نکلتا ہے، اسے نفتھا کہتے ہیں۔

۵۔ جو ۱۵۰ اور ۳۰۰ ڈگری حرارت میں صاف جاتا ہے، اس سے کیروسین تیل طیار ہوتا ہے۔

۶۔ اور ۳۰۰ ڈگری حرارت سے جو اجزاء مجتمع ہوتے ہیں ان سے بعض جلانے کے تیل اور ویسلین وغیرہ طیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد جو باقی رہتا ہے وہ کوئلہ کا ایک رقیق مادہ ہوتا ہے جو سڑکوں کی تعمیر میں کام آتا ہے۔

سویز میں جو کارخانہ ہے وہ محض پٹرول سے بنزین اور کیروسین نکالتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ مازوٹ (Mazout) یا جلانے کے تیل کے نام سے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ سویز کا کارخانہ روزانہ جتنا پٹرول صاف کرتا ہے اس کی مجموعی تعداد ۱۰۰۰ ٹن ہے جس میں سے نصف یعنی ۵۰۰ ٹن مازوٹ کا حصہ ہوتا ہے اور بقیہ ۲۵۰ ٹن بنزین اور ۲۵۰ ٹن کیروسین کا۔ ولایات متحدہ میں تقریباً صفائی کے ۲۶۰ کارخانے ہیں جن میں لاکھوں پیپے تیل روزانہ تیار ہوتا ہے۔

پہلے پٹرول کی قسموں میں کیروسین کو بہت زیادہ اہمیت دیجاتی تھی، آج چونکہ موٹروں اور طیاروں کی حیرت انگیز کثرت ہوتی جارہی ہے اس لئے گیسولین اور بنزین کی طلب بہت زیادہ ہوتی جارہی ہے۔

پٹرول اور جدید علمی تحقیقات

باوجود ان تمام کامیابیوں کے پٹرول کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ چنانچہ مشہور امریکی کروڑپتی جان روکفلر نے نصف ملین ڈالر صرف اس لئے دئے ہیں کہ پٹرول کے متعلق علمی تحقیقات کو ترقی دیجائے۔ اس کے لئے کمیٹیاں اور کانفرنسیں قایم کی گئی ہیں تاکہ اس موضوع پر علمی و کیمیاوی اور طبقاتی تحقیق کی جائے اور اس سلسلہ میں وہ یہاں تک پہونچ چکے ہیں کہ انھوں نے پٹرول سے متعدد قسم کے عروق (Alcohols) طیار کئے ہیں جن سے تیزاب، ربڑ اور دوسرے مختلف مرکبات بنا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم مسٹر مورس کے ایک بیان کی تلخیص پیش کرتے ہیں تاکہ پٹرول سے جو توقعات دنیا نے قایم کی ہیں ان کی ہلکی سی جھلک سامنے آسکے۔ لکھتے ہیں:۔

"خیال کرو کہ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی ہے، فضا نہایت خوشگوار ہے، اس وقت تمھارا دل چاہتا ہے کہ تم موٹر پر سوار ہوکر تفریح کے لئے کہیں سیر کو جاؤ، تم جاکر موٹر کے انجن کو دیکھتے ہو تو اس میں تمھیں تھوڑا سا تیل نظر آتا ہے لیکن تمھیں یہ توقع ہے کہ یہ کافی ہوگا، کیونکہ محض ایک گیلن تیل میلوں کی مسافت طے کرنے کے لئے کافی ہے۔ پھر تم پہیے کے تیل کی طرف ملتفت ہوتے ہو جو پہیوں پر صفائی کے لئے لگایا جاتا ہے، تو تم اسے بھی حسب منشا کافی پاتے ہو حالانکہ بہت دنوں سے تم نے اس پر دوسرا روغن نہیں چڑھایا ہے، اس کے بعد تم موٹر کی پالش کو دیکھتے ہو تو اسے بھی سمجھتے ہو کہ یہ بھی درست ہے۔ لیکن کیا تم کچھ سمجھے اس کا اصل راز پٹرول ہے! اسی طرح تم پہیے کے ٹائر پر نظر ڈالتے ہو تو اس کے ربر کو بھی بالکل صحیح و سالم پاتے ہو حالانکہ یہ لاتعداد میلوں کی مسافت طے کر چکا ہے، اس کا بھی راز پٹرول ہے! اس کے بعد تم اس کے گدوں پر ٹیک لگاتے ہو تو اسے بھی باوجود اس کے کہ وہ پرانا ہو چکا ہے، کافی آرامدہ اور نرم پاتے ہو، اس کی بھی اصلیت پٹرول ہے!

ان چیزوں سے قطع نظر پھر تم موٹر میں کہیں کچھ چربی سی چیز لگی دیکھتے ہو تو اسے اپنے ہاتھوں سے رگڑ دیتے ہو جس سے وہ تمھارے ہاتھ میں لگ جاتی ہے، اب تم اسے دھونا چاہتے ہو تو اس کے لئے تمھیں سب سے بہتر وہی صابون ملتا ہے جو پٹرول کے ذریعہ سے طیار کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد تم موٹر اسٹارٹ کرتے ہو، کچھ دور پر جاکر ایک وادی کے موڑ سے تمھاری موٹر گزرتی ہے، تم وہاں پر دیکھتے ہو کہ اس موڑ کو وسیع کرنے کے لئے مزدور بڑے بڑے پتھروں کو اکھاڑنے میں مصروف ہیں مگر اس میں انھیں کامیابی نہیں ہو رہی ہے بالآخر پٹرول نکالنے والی کلوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح آگے چلکر ایک کارخانہ نظر آتا ہے جو زمین کی کھاد طیار کرتا ہے، اس میں بھی ہیڈروجن پایا جاتا ہے جو پٹرول سے بنتا ہے۔ پھر جب دیر تک تم سیر کر لیتے ہو تو تمھیں کچھ تھکان سی محسوس ہوتی ہے، تم موٹر روک کر ایک دواخانہ کے پاس اُتر پڑتے ہو اور سکون بخش دوا مانگتے ہو تو تمھیں ایک بیحد خوش مزہ چیز ملتی ہے، لیکن اس میں بھی پٹرول کا امتزاج ہے، اس کے بعد تم وہاں کی مختلف چیزوں اور عرقوں اور دواؤں پر نگاہ ڈالتے ہو تو ہر چیز میں پٹرول کا امتزاج نظر آتا ہے۔"

اسی طرح سے فاضل موصوف نے ایک بہت ہی تفصیلی منظر پیش کر کے ثابت کیا تھا کہ دنیا کے تمدن میں پٹرول نے کتنا عظیم الشان درجہ حاصل کر لیا ہے جس سے ایک سکنڈ کیلئے الگ ہونا ممکن نہیں۔

پٹرول کی اصلیت

علماء کیمیا پٹرول کا اصل مادہ دریافت کرنے میں پوری سرگرمی سے منہمک ہیں، پتھر کے کوئلہ کے بارے میں تو سب کا اتفاق ہے کہ اس کی اصلیت نباتات ہیں جو طبقات ارض کے تہ بہ تہ جم جانے کی وجہ سے اندر دب کر رہ گئے اور بیس ہزار سال تک حرارت سے دوچار ہوتے رہے تو کوئلہ کی شکل میں متبدل ہو گئے۔ لیکن پٹرول کی اصلیت اور اس کی کیفیت و پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں دو اہم رائیں پیش کی جاتی ہیں، ایک یہ کہ پٹرول کی اصلیت معدنی مادے

ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ عضوی اور حیوانی مادّوں سے بنا ہے۔

جو لوگ پٹرول کی اصلیت حیوانی و نباتاتی مادّے قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ قدیم طبقات ارض میں بہت سے حیوانی مادے جمع ہو گئے تھے جنھوں نے حرارت پاکر وہی شکل اختیار کر لی جو نباتاتی مادّوں کی کوئلہ بنتے وقت ہو جاتی ہے، اس کے بعد جب انھیں اور مزید حرارت ملی تو ان سے پگھل کر پٹرول اور پٹرول کی مخلوط گیسیں خارج ہونے لگیں، ان کی اس رائے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ پتھر کے کوئلہ کو بھی مزید حرارت پہونچانے سے خام پٹرول نکل سکتا ہے۔ مگر جو لوگ اسے معدنی مادّوں سے خارج مانتے ہیں وہ اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ بہت سے ایسے طبقات ارض سے بھی پٹرول برآمد ہوتا ہے جہاں حیوانی مادہ نہ تھا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ پٹرول دھاتوں اور معدنی مادوں سے مخلوط ہے۔

پٹرول قوّت کی حیثیت سے

اس وقت پٹرول سے قوت پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے اور دنیا کی ۲۲ فیصدی قوتیں پٹرول سے پیدا کی جاتی ہیں اور ۷۰ فیصدی پتھر کے کوئلہ سے پٹرول کا زیادہ تر استعمال موٹروں، طیاروں اور جہازوں میں ہوتا ہے، اب موٹروں کو لیجئے کہ جن میں بنزین کا استعمال ہوتا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں موٹروں کی کل تعداد ۲۴۵۸۹۲۶۴۹ کے قریب تھی۔

لوگوں کا خیال ہے کہ آیندہ چلکر موٹروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو جائے گا یہاں تک کہ ۱۹۵۰ء میں موٹروں کی تعداد ۴۵ ملین ہو جائے گی جس کے لئے ۱۹۱۳۳ ملین گیلن تیل چاہئے اور ۱۹۲۵ء میں جتنا گیسولین اور بنزین طیار ہوا اس کی مقدار محض ۹۱۶۰ ملین گیلن تھی۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمین کے اندر اتنے مادے موجود ہیں جو آیندہ عالم کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کر سکیں؟ اس کے متعلق علماء کا خیال ہے کہ زمین میں کوئلہ کی اتنی مقدار موجود ہے جو ہزاروں سال کے لئے کافی ہوگی باقی رہا پٹرول تو اس کے بارے میں کوئی قطعی رائے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک بہت بڑا اقتصادی سوال ہے جس کے حل کرنے میں علماء ہمہ تن مصروف ہیں بعض کا خیال ہے کہ خام نباتاتی مادّوں سے ایک سیال مادہ طیار کیا جا سکتا ہے جو پٹرول کا کام دے سکے چنانچہ انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ الکوحل اور بعض نباتاتی تیلوں میں پٹرول اور بنزین جیسے مادوں کا امتزاج کر کے انھیں پٹرول کی جگہ استعمال کیا جا سکتا ہے مگر ابھی تک کوئی ایسی راہ نہیں نکلتی ہے جس سے اس طریقہ کو کام میں لایا جا سکے۔ اس کے علاوہ پٹرول طیار کرنے کے اور طریقے بھی ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ روغنی مٹی کو جو ایک خاص قسم کی ہوتی ہے کوئلہ کی طرح پگھلا کر ایک سیال مادّہ بنایا جائے جو ایک طرح کا پٹرول ہو سکتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پتھر کے کوئلہ کو جو ایک منجمد آتشیں مادہ ہے پگھلا کر سیال مادہ بنایا جائے۔

برگیوس کی ترکیب

مشہور جرمنی عالم برگیوس (Bergeus) کا خیال ہے کہ پٹرول میں کاربن اور ہیڈروجن کی نسبت ۸ : ۱ کی ہے اور پتھر کوئلہ میں ان کی ۱۸ : ۱ کی نسبت ہے لہذا کوئلہ کو پٹرول بنانے کے لئے اس میں ہیڈروجن کی زیادتی کرنی پڑے گی۔

ان کے اس پوری ترکیب کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے پتھر کوئلہ کو بہت باریک کر لیتے ہیں اور پھر کسی تیل میں رکھدیتے ہیں اور اس کے بعد ہیڈروجن گیس کے ۴۵۰ ڈگری حرارت میں اسپر کیمیائی عمل کرتے ہیں جس سے اس کوئلہ کا اکثر حصہ پٹرول ہو جاتا ہے، اس طریقہ سے برگیوس نے تقریباً کوئلہ کی متعدد قسموں کو پٹرول میں تحویل کر لیا ہے اور اس کے لئے جرمنی میں ایک کارخانہ بھی قائم کیا ہے، اس ترکیب سے جو تیل طیار ہوتا ہے اس میں ۳۰ فیصدی گیسولین اور ۳۰ فیصدی مازوٹ اور ۴۰ فیصدی وہ تیل ہوتے ہیں جو پالش وغیرہ کے کاموں میں آتے ہیں مگر اس ترکیب کا اب تک تجارتی اُصول پر تجربہ نہیں کیا گیا ہے اس ترکیب کو ایجاد کرنے میں برگیوس نے سالہا سال صرف کئے ہیں اور اس کے لئے ایک عظیم الشان کمپنی نے ان کی بڑی بڑی امدادیں بھی کیں

فائشر کی ترکیب

دوسری ترکیب بھی ایک دوسرے جرمنی محقق فرانز فائشر (Franz Fischer) کے اختراع کا نتیجہ ہے، یہ اپنے طریقہ میں گزشتہ ترکیب سے مختلف ہے مگر نتیجہ کے لحاظ سے دونوں متحد ہیں، ترکیب یہ ہے کہ وہ پہلے کوئلہ کو گرم کرتے ہیں اور پھر بھاپ کے ذریعہ اسے گیس کی شکل میں بدل لیتے ہیں اور اس کے بعد اسے لوہے، کوبلیٹ (Cobalt) اور کروم (Chrome) وغیرہ دھاتوں کے خام اور فاسد اجزا سے گزارتے ہیں جس سے وہ رقیق گیس پٹرول کی شکل میں تحویل ہو جاتی ہے۔

(صدرالدین عظیم)

تذکرۂ معرکۂ سخن

اپنے رنگ کا بالکل پہلا تذکرہ، جس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے اساتذہ کے کلام پر کیا کیا اعتراض کئے اور یہ کہ ان کا کوئی جواب ہو سکتا ہے یا نہیں یہ تذکرہ انتہائی کاوش کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور فن شعر کے متعلق بے بہا معلومات کا ذخیرہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ آٹھ آنے (ع ۸)

منیجر نگار۔ لکھنؤ

مکتوباتِ نیاز

سنئے صاحب ، جیتے جی موت کی باتیں مجھے پسند نہیں ۔ مرنا برحق سہی ، لیکن جب تک آپ جی رہے ہیں اس "واویلا" سے فایدہ بھی کیا ہے ، آخرت کے خیال کو آپ "مابعد الموت" سے کیوں متعلق کرتے ہیں۔ آخرت سے مُراد انجام ہے — ہر اُس کام کا انجام جو ہم آپ اس دُنیا میں کرتے ہیں ، ورنہ

مردِ آخر بیں مُبارک بندہ ایست ! کے معنے کیا ؟

خدا کے لئے اس خیال کو ترک کیجئے ، آپ کی صحت پر خراب اثر پڑے گا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مایوس کرکے بیکار بنادیں گے — لاحول ولا قوۃ ۔ آپ سے کس نے کہا کہ اسلام کی تعلیم ہر وقت موت کو یاد کرنا ہے ۔ مسلمانوں نے تو موت کا مقابلہ کیا ہے ، اس سے جنگ کی ہے اور ایسی جنگ کہ ان میں بہت سے مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں اور آپ ہیں کہ زندگی ہی میں مرے جارہے ہیں !

اگر بُرا نہ مانئے تو عرض کروں کہ نماز روزہ کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کوئی گناہ بھی کرلیا کیجئے ۔ کیونکہ زندگی کا احساس گناہ کے بعد بڑھ جاتا ہے — پہلے چھوٹے چھوٹے اور جب کچھ جان بدن میں آجائے تو بڑے بڑے !

جوانی ختم ہونے کے بعد جوانی کا اعادہ ممکن ہے "کایا پلٹ بوٹی" سے بھی ہوجاتا ہو ، لیکن آسکر وائلڈ کا نسخہ یہ ہے کہ "جوانی کے گناہ کرنے لگو ، جوانی خود لوٹ آئے گی"

اگر آپ اس کے لئے طیار ہوں تو مطلع کیجئے ، تاکہ ہم آپ دونوں ایک ہی ساتھ اس کا تجربہ شروع کریں — واقعی ذرا دیکھئے تو سہی ہوتا کیا ہے ؟

بجا ہے ۔ صرف ایک بار گلہ کیا تھا اور وہ بھی "طاتمام" کہ آسمان زمین آپ نے ایک کردئے اور اب چاہتی ہیں کہ جو کچھ کہنا ہے دل کھول کر کہدوں — معقول !

طشتے دگر فتادہ ہمانا زبام تو !

اگر یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اخیر میں آپ مجھے ، موردِ الزام قرار دیں ، تو یہ کاوش بیکار ہے ، کیونکہ "آپ سے دور ہوں

اور جی رہا ہوں"۔ یہی ایک جُرم اتنا بڑا ہے کہ آپ جس قدر ملامت کریں کم ہے ۔۔۔ زیادہ چھان بین کی ضرورت کیا ؟
میں نے تو صرف پوچھا تھا کہ "آشنا گاہے، گہے ناآشنا"۔ یہ ادا آپ کی عام ہے یا صرف میرے لئے مخصوص ! آپ نے اس کے جواب میں "فلسفۂ محبت" اور "نکات عشق" پر ایک لکچر دے ڈالا۔ حالانکہ :۔

گر گفتۂ زعشق گہے حرف آشنا
آں ہم حکایتے ست کہ از ما شنیدۂ!

میں نے اس پر آپ سے پوچھا کہ "کیا عورت زیادہ پڑھ لکھ کر صرف بقراط ہی بن سکتی ہے ؟"۔ اس کا جواب دراصل یہ ہونا چاہئے تھا کہ آپ ہنس دیتیں ۔۔۔ اور باور کیجئے اسی خیال سے میں نے لکھا بھی تھا ۔۔۔ لیکن خلاف امید آپ اور سنجیدہ بن گئیں ۔۔۔۔ اگر آپ برہم ہوتیں، تو بھی میں اس سے لطف اُٹھا لیتا، لیکن اس "روڑھے پن" کو کیا کروں، آپ ہی بتائیے؟
دیکھئے اس کے جواب میں آپ چاہے پورا قرآن لپیٹ کر بھیجدیں، لیکن خاموشی کی سند نہیں ۔ ورنہ پھر میری "بُت پرستی" کا مظلمہ سارا آپ کی گردن پر ہوگا !

میرے عزیز دوست ۔ آپ سے کس نے کہدیا کہ میں خفا ہوں ۔ یقیناً میں خطاوار ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل اب تک نہیں کرسکا، لیکن مجبوری اور برہمی میں تو بڑا فرق ہے ۔ میں شاید اب بھی خط نہ لکھتا، لیکن اتفاقاً آپ سے سرخرو ہونے کا موقعہ ہاتھ آگیا، اس لئے معذرت و مبارکباد دونوں پیش کر رہا ہوں
میں اُن سے مل لیا، آپ کوئی اندیشہ دل میں نہ لائیں اور جو کچھ ہو چکا ہے، اسے کالعدم سمجھ لیں ۔۔۔ آپ کو کسی نے غلط خبر دی ۔ وہ تو نہایت معقول انسان ہیں !

حضرت ۔ اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ وہاں کیا گزری، بس یوں سمجھئے کہ
ہم اُٹھاتے ہی بچھاتے رہے بستر اپنا
معاذ اللہ، تلوّن سا تلوّن ! بیقراری سی بیقراری ! بس یوں سمجھئے کہ ذوالفقار کی تعریف میں میر انیس کا یہ بند سامنے تھا

وہ جوڑ توڑ یاد تھے اس تیغِ تیز کو — سر سے گری جُدا کیا پائے گریز کو
اپنے سے گرم دیکھ کے اس شعلہ رنز کو — برق و شرر نے نذر کیا جست و خیز کو
بُو گل نے، رنگ لالہ نے، سرعت ہوا نے دی
یہ ہدیہ کیا ہے، اپنی نیابت قضا نے دی !

مجھ میں تو اب دوبارہ وہاں جانے کی ہمت نہیں، ہاں اگر آپ ساتھ ہوئے تو خیر چلا چلوں گا !

ماشاء اللہ، کیا نظم لکھی ہے، کیا تیور ہیں۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ اس سے لطف اُٹھانے کے لئے "وارنافٹ" کو کہاں ڈھونڈھوں۔ ڈاکٹر اشرف الحق حیدر آبادی نے بھی "اعادۂ شباب" کا آپریشن شاید اب ترک کر دیا ہے!

آپ کیوں نہ "کوک شاستر" کو نظم کر ڈالیں۔ کیا اس سے بہتر ترقی پسندانہ لٹریچر کوئی اور ہو سکتا ہے؟

بندہ نواز، عُریانی بُری چیز نہیں بشرطیکہ وہ "نیم عریانی" سے آگے نہ بڑھے۔ بدن چُرا کر چلے جانے میں، سینہ نکال کر سامنے آجانے سے شاید زیادہ لطف ہے

کنایہ و استعارہ وغیرہ کو چھوڑیئے، شاعرانہ ڈھکوسلے سہی، لیکن انسان کے نفسیاتی رجحان کو آپ کیونکر بدل سکتے ہیں۔ آرٹ کا کمال یہ نہیں کہ وہ اپنے سامنے دیوار حایل کر دے، وہ اپنی جگہ بالکل بیکار چیز ہے اگر دوسروں کو اس تک پہونچنے کی رغبت نہ ہو۔ لباس تار تار ہو جانے کے بعد لباس نہیں رہتا۔ موسیقی نام سُر کے ٹکڑے کر دینے کا نہیں بلکہ مختلف سُروں کو ہم آہنگ کر دینے کا ہے۔ آپ کی شاعری ایسی "جراحی" ہے جس کے زخم سے فاسد مادہ ہمیشہ رستا رہے گا اور سوائے عفونت پھیلانے کے اس کا کوئی نتیجہ نہیں

دُنیا میں ہر چیز کی ایک تہذیب ہوتی ہے اور شاعری کی بھی ایک تہذیب ہے۔ آپ نہ مانیں یہ اور بات ہے، لیکن جب تک ساری دُنیا غیر مہذب نہ ہو جائے آپ کو رنج ناکامی اُٹھانا ہی پڑے گا

عتاب نامہ ملا، لیکن مجبوری دیکھئے کہ اسے "عتاب" کہنے کی بھی تاب مجھ میں نہیں!

چہ تواں کرد مرا با تو سرے افتادست!

اگر مقصود صرف "معذرت" سے لطف اُٹھانا ہے تو پہلے کوئی گناہ تو کر لینے دیجئے۔ "عذر بیگناہی" میں کیا رکھا ہے؟ باور کیجئے میں نے کبھی اُن سے رسم و راہ بڑھانے کا اقدام نہیں کیا۔ آپ کو سمجھنا چاہئے کہ اگر دل خون کرنے کی فرصت نصیب ہو، تو کیا آپ سے بہتر کوئی دوسرا اور ہو سکتا ہے؟

منزل پر تھک کر بیٹھ چکا ہوں۔ نہ اُٹھنے کی تاب، نہ چلنے کی ہمت، اور صرف اس امید پر جی رہا ہوں کہ

روزے بہ شکار خواہی آمد

لیکن آپ کو اس کی بھی فرصت نہیں — خیر جانے دیجئے ابھی اتنا سہارا باقی ہے کہ

چہ می کردیم یارب گر نبودے نارسیدنہا!

مکرمی۔ مکرمت نامہ کا شکریہ۔ مجھے معلوم ہے کہ جنوری کے نگار سے بعض شعراء خوش نہیں ہیں۔ لیکن میرا مقصود بھی تو صرف "قصیدہ خوانی" نہ تھا — اگر کسی کو اختلاف ہے تو وہ اظہارِ رائے کے لئے آزاد ہے اور نگار کے صفحات حاضر

ہیں۔ مگر بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ہم لوگ ہر علمی یا فنی گفتگو کو "ذاتی" حربہ سمجھنے لگتے ہیں ۔ بہر حال کوئی لکھے یا نہ لکھے، آپ ضرور تفصیل کے ساتھ اپنی رائے لکھ بھیجئے، اشاعت کے لئے نہ سہی، میری رہنمائی کے لئے!

جی ہاں، میں نے بھی سُنا ہے کہ عبدالماجد دریابادی آج کل مودودی سے برسرِ جنگ ہیں

یا علی مدد ے!

افسوس ہے میرے پاس نہ ترجمان القرآن آتا ہے نہ صدق، ورنہ دیکھتا کس کے "ناخن و چنگال" زیادہ تیز ہیں۔ ایک وقت تھا کہ عبدالماجد، ہر گمراہ کو آستانۂ مودودی پر حاضری کا مشورہ دیتے تھے، لیکن اب شاید انھیں اپنی اس گمراہی کا پتہ چل گیا ہے۔ مجھے تو کچھ خبر نہیں، لیکن اگر آپ کو معلوم ہو تو بتائیے کہ "استخوانِ جنگ" کیا چیز ہے

مکرمی - ابھی ابھی گرامی نامہ ملا - امید ہے جواب روانگی سے پہلے آپ تک پہونچ جائے گا — آپ زحمت نہ فرمائیے، میں اس قابل نہیں، کہ آپ کی پذیرائی کر سکوں - میہمانی و میزبانی کا اُصول میرے یہاں بالکل جُدا ہے۔ آپ سے اگر اتنی بے تکلفی ہوتی کہ میں جو چاہتا آپ کے سامنے کر سکتا تو مضایقہ نہ تھا، لیکن چونکہ میں ایسا نہ کر سکوں گا، اسلئے مجھے تکلیف ہوگی اور جس مہمان سے تکلیف ہو وہ مجھ پر بار ہو جاتا ہے

لیکن ایک صورت اور ہے، وہ یہ کہ ہوٹل میں آپ کے قیام کا انتظام کرادوں اور مصارف میں ادا کردوں —— اس طرح آپ کو بھی آرام پہونچے گا اور مجھے بھی کوئی زحمت نہ ہوگی - اگر یہ شرط منظور ہو تو شوق سے تشریف لائیے اور جب تک جی چاہے قیام فرمائیے - میں حاضری بھی دیا کروں گا، لیکن کبھی کبھی - کھانا بھی آپ کے ساتھ نہ کھا سکوں گا، کیونکہ میں جس آزادی یا بدتمیزی کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں وہ آپ کے ساتھ مجھے میسر نہ آئے گی

مطبوعاتِ طاقِ بستاں

(بہترین انتقادی لٹریچر)

خواب کی دُنیا: اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے، جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ/

الہامات شاد: شادؔ عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہو لیکن انکے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولنا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے قیمت ۸/

مقامِ محمود: مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ — قیمت پانچ روپیہ (صہ)

اقبال کی شاعری: یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت ۱۰/

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

وقت کی باتیں

جاپان کے آلات حرب

اس لڑائی میں سب سے بڑی غلطی جمہوریتوں نے یہ کی کہ دشمنوں کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کر سکیں۔ جرمنی کی بابت تو خیر انھیں کچھ اندازہ تھا بھی، لیکن جاپان کے متعلق وہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ چین نے اس کی قوت کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

جاپانی حکومت نے ہمیشہ اپنی قوت کو چھپایا اور اسے ایک سخت راز کی صورت میں رکھا۔ دوسرے ممالک کے لوگ وہاں پہونچکر بھی کوئی صحیح اندازہ جاپان کی قوت کا نہ کر سکتے تھے کیونکہ زبان، صورت اور وضع کے اختلاف کی وجہ سے وہ الگ پہچان لئے جاتے تھے اور ان کی نقل و حرکت کی سخت دیکھ بھال ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ اطلاعات انھیں ملیں وہ حکومت ہی کے ذریعہ سے ملیں اور وہ خود کوئی تحقیق چل پھر کر نہ کر سکے۔

نازی جماعت کے عروج کے وقت ہی سے، جاپان، جرمنی سے بہت متاثر تھا۔ اور اپنی فوجی تنظیم کے لئے اس نے جرمنی ہی سے آدمی بلائے اور جب وہ محوری مرکز میں شامل ہو گیا تو اس نے بحر پاسفک کی جنگ کے لئے بڑی زبردست طیاریاں شروع کر دیں اور پچھلی جنگ میں جرمنی کے جو جزایر بحر پاسفک میں اس کے ہاتھ آئے تھے ان کو بحری اڈوں میں تبدیل کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۰ء تک اس کی بحری قوت امریکہ کی پاسفک قوت کے برابر ہو گئی۔

جاپان کے چودہ بڑے جنگی جہازوں میں سے چار بالکل نئی قسم کے ہیں جو ۴۳، ۴۳ ہزار ٹن کے ہیں اور جن میں سے ہر ایک پر ۱۶ انچ دہانے کی بارہ بارہ توپیں نصب ہیں۔

ان کے علاوہ جاپان کے پاس چار آہن پوش جہاز بھی ہیں جو بہت قوی ہیں اور ۲۲ ہلکے کروزر بھی۔ انکے علاوہ آٹھ طیارہ بردار جہاز اور ۱۰۰ سے زیادہ آبدوز کشتیاں بھی ہیں۔

تعداد کے لحاظ سے یقیناً برطانیہ اور امریکہ کی بحری قوت زیادہ ہے، لیکن جاپان کی قوت بھی ایسی نہیں کہ اسے ہیچ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ اس نے بحری قوت کے ساتھ اپنی فضائی و بری طاقت کو بھی بہت بڑھا لیا ہے۔

یورپ کی پچھلی جنگ نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ بغیر فضائی قوت کے بحری قوت بیکار ہے، اس لئے جرمنی نے سب سے زیادہ توجہ اسی طرف صرف کی اور اس کی تقلید جاپان نے بھی کی۔ ہر چند جاپان کے سامنے بعض اقتصادی مشکلات بھی تھیں اور ہوائی جہازوں کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی اس کے یہاں کم پائی جاتی ہیں، لیکن اس نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کر کے اپنی ہوائی طاقت کو کافی حد تک بڑھا لیا۔

امریکی ماہرین کا بیان ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جاپان کے پاس پانچ ہزار اول قسم کے طیارے موجود تھے اور سالانہ آٹھ ہزار طیارے [illegible] تھا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ جاپان نے ارادہ کر لیا ہے کہ وہ ۱۹۴۲ء تک ۳۰ ہزار طیارے بنائے گا۔ گو ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو سکتا [illegible] اس کے پاس دھاتوں کی بہت کمی ہے تاہم سال رواں میں اس کی ہوائی قوت یقیناً پہلے سے بہت زیادہ ہوگی۔ بحر پاسفک میں لڑائی شروع ہونے سے پہلے امریکہ اور [illegible] کے اخباروں نے لکھنا شروع کیا کہ جاپان کے پاس اگر ہوائی جہاز کافی تعداد میں ہوں بھی تو کیا ہوتا ہے، کیونکہ وہاں کے جہاز ران ناقص ہیں اور ان کے سر، گردن اور آنکھوں کی فطری ساخت انھیں قدر انداز ہوا باز نہیں بنا سکتی، لیکن فوراً بعد ہی ایک اور امریکی ماہر نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ جاپانی ہوا باز بہترین قسم کے ہوا باز ہیں اور امریکی و برطانوی ہوا بازوں کے مقابلہ میں وہ بہت زیادہ عرصہ تک پرواز کر سکتے ہیں اور ان کا نشانہ بھی نہایت اچھا ہے۔

جاپانی جہاز کچھ تو امریکی وضع کے ہیں اور کچھ جرمن وضع کے۔ ان میں ۶۰ فی صدی (Fighters) ۳۰ فی صدی بم برسانے والے اور ۱۰ فی صدی بار بردار۔ بعض جہاز دو ہر انجن کے ہیں اور دو ہزار پونڈ وزن کے بم لیکر ۱۵۰۰ میل تک بغیر دم لئے پرواز کر سکتے ہیں۔ دوسرے آلات حرب میں بھی، جاپان کسی سے پیچھے نہیں ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے پاس

ٹینکوں کی تعداد کتنی ہے۔ جاپانی فوج بہت بڑی ہے جو چین کی لڑائی کے بعد سے برابر بڑھ رہی ہے، چونکہ جاپان کی آبادی بہت زیادہ ہے، اس لئے سپاہیوں کی اس کے پاس کمی نہیں اور چین کے میدانوں میں ان کی فوجی تربیت کا بھی کافی موقعہ لگیا ہے — اس میں شک نہیں کہ جاپان اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہے لیکن اس نے ان مشکلات کو اس طرح دور کیا ہے کہ ملک بھر میں جنگجویانہ جذبات پیدا کرکے سب کو لڑنے بھڑنے پر آمادہ کردیا ہے اور نازی جماعت کی طرح لڑائی کو مذہب بنالیا ہے، چنانچہ آج جاپان میں، لاکھوں آدمی میدان جنگ میں ہیں اور لاکھوں فوجی کارخانوں میں کام کررہے ہیں۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے وہ وقت کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور زیادہ عرصہ تک لڑتے رہنے کی تاب اس میں نہیں ہے۔

جنگی جہاز کی عظمت!

آجکل آپ روز سنتے ہوں گے کہ فلاں جہاز فلاں سمندر میں ڈوب گیا اور آپ اس کو نہایت معمولی بات سمجھتے ہوں گے لیکن اگر آپ کو ایک جنگی جہاز (Battle - Ship) کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو تو آپ سمجھیں کہ دراصل کسی ایک بڑے جہاز کا ڈوب جانا، قوم کے ایک بازو کا ٹوٹ جانا ہے۔ آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ ایک جہاز کی تعمیر سے چوبیس قسم کی مختلف تجارتیں متعلق ہوتی ہیں اور اگر جہازوں کی تمام قسموں کو سامنے رکھکر اندازہ لگایا جائے تو نہ صرف میکانکی حیثیت بلکہ اقتصادی حیثیت سے بھی اعداد و شمار کی اتنی طویل فہرست بن سکتی ہے کہ ہم اس کی اہمیت کو سوچ بھی نہیں سکتے۔ مثلاً آپ صرف طیارہ بردار جہاز اور کروزر (آہن پوش) ہی کو لے لیجئے تو ان میں سے ہر ایک کے لئے علی الترتیب دو ہزار اور پندرہ سو نقشے طیار کرنے پڑتے ہیں۔

تعمیر کی ابتدا سے لیکر سمندر تک پہونچنے میں ایک جنگی جہاز کو ۶ مہینے کا زمانہ چاہئے یعنی اگر غیر معمولی عجلت سے کام نہ لیا جائے تو وہ جہاز جس کی تعمیر ۱۹۴۲ء میں شروع ہوئی ہو ۱۹۴۳ء میں اپنے فرائض انجام دینے کے قابل ہوگا۔ پورا ایک سال تو ڈیزائن یا نمونہ کی طیاری میں صرف ہوجاتا ہے، اس کے بعد چار مہینے نقشوں کے لئے چاہئے اور تین مہینے لاگت کا تخمینہ کرنے کے لئے۔ اس کے بعد ۱۵ مہینے تعمیر میں صرف ہوتے ہیں اور چھ مہینے اس کی جانچ اور عملۂ جہاز کی تربیت میں۔

۳۵ ہزار ٹن کے جہاز کی تعمیر میں ۸ گھنٹے روزانہ کام کرنے کی صورت میں ۴۰ لاکھ آدمیوں کی محنت صرف ہوتی ہے اور یہ صرف گودی کے اندر اندر کا حال ہے۔ گودی سے باہر نکلنے کے بعد جو محنت اس پر صرف ہوتی ہے اس کو بھی اگر اس میں شامل کرلیا جائے تو شمار ۹۵ لاکھ آدمیوں تک پہونچتا ہے۔ چھوٹے جہازوں کی تعمیر میں یقیناً کم زمانہ صرف ہوتا ہے لیکن نہ اتنا کم کہ سالوں کا کام مہینوں میں ختم ہوسکے، چنانچہ ایک ۱۶ ہزار ٹن کے تباہ کن جہاز کی تعمیر میں بھی پورے ۲۰ مہینے اور گیارہ لاکھ آدمیوں کی محنت صرف ہوتی ہے۔

جہازوں کی تعمیر میں جلدی کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی جہاز کی تعمیر ختم ہونے سے پہلے ہی دوسرے جہاز کا کام شروع کردیا جائے اور دوسرے یہ کہ متعدد مقامات پر کارخانے قایم کئے جائیں، لیکن چونکہ یہ کارخانے سمندر کے کنارے ہی قایم ہوسکتے ہیں اور ساحل کا ہر حصہ قیام کارخانہ کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا، اس لئے جگہ کا سوال بھی بجائے خود بہت مشکل ہے۔

امریکہ میں جہاز سازی کی صنعت دو حصوں میں منقسم ہے، ایک سرکاری اور دوسرے پرائویٹ، یعنی امریکہ کی حکومت خود بھی جہاز تعمیر کراتی ہے اور دوسرے کارخانوں سے خریدتی بھی ہے، لیکن ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں جہاز سازی کا کام اتنا پھیل گیا کہ حکومت کو خود اپنے لئے بھی اور تاجروں کے لئے بھی اپنے صرف سے نئی نئی گودیاں بنوانا پڑیں تاکہ وہاں بھی کام ہوسکے۔

اس صنعت کا حال

(بہترین جگہ پر پہونچ جائے اور اسی لئے حکومت کو بھی بہت سے بیرونی ٹھیکہ داروں سے کام لینا پڑتا ہے، ورنہ

جواب دیا: اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے، نقصان کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں لیکن باوجود تمام احتیاط کے تاخیر ہوتی ہی ہے۔ جہاز کا بالائی

عبدالمالک آروی نے فریوڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو بنایا ہے اور اس کے مختلف حصوں کو اتنی بلندی تک لیجانا آسان کام نہیں۔

الہامات شاد: شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہو لیکن انکے کلام کا انتخاب بہت ہو تو ۴ یا ۵ فیصدی تعمیر ہونے کے بعد ہی اسے سمندر میں لے جاتے ہیں۔ یہاں اُسے

مقام محمود: مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ۔ قیمت، تجربہ کار کام کرنے والوں کی بڑی ضرورت ہوتی اور جوں جوں جہاز کی تعمیر ختم کے قریب

اقبال کی شاعری: یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اتلانٹک میں اپنی قوت کو جس حد تک بڑھانا چاہتا ہے وہ ۳۵ بڑے جنگی جہاز، ۲۰ بردار جہاز ۲ کروز، ۷۰ لاکھ ٹن۔ ایک تباہ کن جہاز ۸۵ لاکھ ڈالر میں اور ایک آبدوز

مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت ۱۰ر اس سے حاصل ہو اس کو پھر ۳½ سے ضرب دیکر روپیہ بنائیے، اگر ریاضی کے اعداد

معلومات عامہ

مکڑی اور جنگ

تاریخ انسانی میں مکڑی بارہا مفید ثابت ہو چکی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج بھی وہ اپنے اس اہم کردار کو ادا کر رہی ہے۔ موجودہ زمانہ کی اہم ایجاد (Periscope) ہے جس کی مدد سے آبدوز کشتیوں اور ٹینکوں میں بیٹھنے والے باہر کی چیزیں دیکھتے ہیں، اس میں ایک شیشہ ہوتا ہے جس میں آنکھ لگا کر تمام چیزیں دیکھی جاتی ہیں، یہ شیشہ عمودی اور افقی لکیروں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ان لکیروں کو قطعی طور پر صحیح ہونا چاہئے۔ کیونکہ شیشہ کی یہی وہ لکیریں ہوتی ہیں جن سے رخ اور فاصلہ کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان لکیروں کو اتنا باریک بھی ہونا چاہئے کہ ان سے چیزوں کے دکھائی دینے میں کوئی فرق نہ پڑے۔ عام انسانی سر کا بال بھی اس کام کے لئے بہت موٹا ہوتا ہے۔ لیکن مکڑی کے جالے کا تار، جو ایک انچ کے $\frac{1}{1000}$ سے لیکر $\frac{1}{12000}$ انچ تک باریک ہوتا ہے اس کام کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر مکڑی کے جالے کا تار اتنا باریک نہ ہو تو بھی اسے اتنے باریک حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی اس کے استعمال کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

مکڑی کا جالا ایک دوسری آلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ آلہ (Theodlite) یہ آلہ پیمایش کے کاموں میں زاویوں کے ناپنے کے کام آتا ہے۔ فیکٹریوں اور ہوائی اڈوں کے لئے زمینوں کے ناپنے اور انکی مختلف نقشوں کے مطابق علیحدہ بانٹنے کا کام اسوقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک (اس آلہ) کا استعمال نہ ہو۔

ایک مرتبہ مکڑی کے جالے کی وسعت معلوم ہو جانے کے بعد جس کا معلوم ہونا بہت ضروری ہوتا ہے، جالے کو ایک بے رنگ اور شفاف وارنش کے ذریعہ سے دیکھنے والے شیشہ پر لگا دیا جاتا ہے اور پھر یہ جالا شدید ترین موسمی تغیرات اور درجہ حرارت کے آثار چڑھاؤ کا بھی اثر نہیں قبول کرتا۔ اس خصوصیت میں دنیا کی اور کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ مضبوط بھی بہت ہوتا ہے۔ چنانچہ جالے کے تاروں کو اگر ایک ایسے دائرہ میں بٹ کر لگایا جائے جس کا قطر $\frac{1}{16}$ انچ ہو تو اسی لمبائی کے کسی دوسرے ڈورے سے ۳۰ گنا زیادہ مضبوط ثابت ہوگا۔ مگر سائنس کے کاموں میں پرانے جالوں کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسے جالے منتخب کئے جاتے ہیں جنھیں بڑے بڑے مکڑوں نے تانا ہے۔

جالوں کے حصول میں بھی بڑی جد و جہد کیجاتی ہے۔ مکڑیوں کو پکڑ کر ہلکے پلنے والے تختوں پر رکھدیا جاتا ہے اور ان کی مسلسل نگرانی ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر وہ ذرا بھی متوحش یا پریشان ہوتی ہیں تو فوراً کسی جگہ چھپ جانا پسند کرتی ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بہترین ماحول کی موجودگی کے باوجود مکڑیاں اپنا کام بند کر دیتی ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ بھی ہڑتال کرنا سیکھ گئی ہیں۔ اس حرفت میں مکڑیوں کو کبھی مارا نہیں جاتا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ایک مکڑی ۵۰ سے ۱۰۰ گز تک کسی لمبائی کا تار اپنے جالے میں تان دیتی ہے تو اسے فوراً رہا کر دیا جاتا ہے۔ ان جالوں کو بہت احتیاط کے ساتھ لکڑیوں پر جمع کیا جاتا ہے۔ حرارت، برودت، اور حرکت سے انھیں بالکل دور رکھا جاتا ہے اور انھیں پھر اسوقت تک نہیں چھوا جاتا ہے جبکہ اُن کے استعمال کا وقت نہیں آتا۔ شمالی انگلستان میں ایک کارخانہ اسی کام کو کر رہا ہے۔ اُس کے مال گودام میں ہزاروں [illegible] کے جالے بھرے ہیں۔

دستی تحریر سے ذہانت کا پتہ

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جنگ نے سیکڑوں طرح کی ضروریات پیدا کر دی ہیں۔ برطانیہ [illegible] یہ ضروریات پیدا ہو رہی ہیں اور انھیں حل کرنے کے لئے نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں۔ آئے دن برطانیہ اور دوسرے [illegible] ملک میں ہزاروں آدمی سیکڑوں قسم کی خدمات بجالانے کے لئے بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس قسم کی عام بھرتی کا سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ کوئی آدمی کسی ایسے کام کے لئے بھرتی کر لیا جائے جس کا وہ اہل نہ ثابت ہو۔ چنانچہ تیز رفتاری کے ساتھ معموں کو حل کرنا، اور دوسرے تمام وہ نفسیاتی طریقے استعمال ہو رہے ہیں جن سے آدمی کی دماغی اہلیت کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ لندن کے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر مائیکل فورڈہم (Michael Fordham) نے ایک اور طریقہ آزمایش پیش کیا ہے۔ یعنی دستی تحریر کا تجزیہ۔ یہ طریقہ کوئی نیا نہیں ہے۔ جرمن دس یا پندرہ سال سے اس طریقہ کو استعمال کر رہا ہے اور ذمہ دارانہ کام سرانجام دینے کی اہلیت معلوم کرنے کے لئے لوگوں کا یہ بہت اچھا ذریعۂ آزمایش ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ ہٹلر کے خاص سفری ہوائی جہاز کا ہوا باز بھی دستی تحریر کی آزمایش کے بعد ملازم رکھا گیا تھا۔

برطانیہ میں بھی بچوں کی رہبری کرنے والے، اور تجارت کرنے والے چند اداروں نے اس نفسیاتی طریقہ کو اختیار کیا ہے۔ خود ڈاکٹر فورڈہم نے زندگی کے مختلف پیشہ وروں میں

اس طریقہ کی کامیابی کے بہت سے تجربات بیان کئے ہیں - اس طریقہ کا سب سے بڑا فایدہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایک شخص کی بنیادی اور پوشیدہ اہلیت اس سے بہت جلد معلوم ہو جاتی ہے اور چند وہ خصوصیات جو یوں آسانی سے معلوم نہیں ہو سکتیں آزمایشوں سے فوراً معلوم ہو جاتی ہیں -

لکھ پتی لوگوں کی مصیبت

۳۰ ہزار پونڈ سالانہ کی آمدنی رکھنے والے شخص کو انگلستان میں لکھ پتی سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی صحیح کیونکہ ۳۰ ہزار پونڈ کا مطلب ۴ لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ سمجھنا چاہئے - اس طرح سے انگلستان میں ۱۰۲۴ لکھ پتی شخص موجود ہیں - امریکہ میں ۴۰۰۰ لکھ پتی ہیں مگر وہاں لکھ پتی کا خطاب فیاضی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور دس لاکھ ڈالر رکھنے والا شخص بھی لکھ پتی کہلاتا ہے -

ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ لارڈ نفیلڈ (Nuffield) سر جان البرمین (Sir John Ellerman.) لیڈی لوئس ماؤنٹ بیٹن (Lady Louis Mountbatten) مس ڈارو تھی پیگٹ (Miss Dorothy Paget) برطانوی لکھ پتی ہر وقت جنت میں رہتے ہوں گے اور انھیں دُنیا کا بہترین اطمینان نصیب ہوگا - مگر یہ صحیح نہیں ہے - ان میں سے اکثر بڑے بڑے اخراجات کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور معلوم نہیں کتنے ملازم رکھتے ہیں -

ٹیکسوں نے ان تمام لکھ پتی لوگوں کو بہت دبا رکھا ہے - شاید انگلستان کا سب سے بڑا دولتمند شخص سر جان البرمین ہے - اس شخص کی عمر ابھی ۴۲ سال کی ہے مگر انھوں نے اپنے باپ سے جو جہاز ران کمپنی کے سب سے بڑے مالک تھے، ایک کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ ورثہ میں پایا تھا - اس کے بعد سے انھوں نے اس زبردست رقم میں بہت بڑا اضافہ بھی کیا ہے - مگر جنگ کے زمانہ میں ٹیکسوں کے ذریعہ سے دولت کا بہت بڑا حصہ کھینچ لیا جاتا ہے - انگلستان کے جن لوگوں کی آمدنی ایک لاکھ پونڈ یعنی تیرہ، چودہ لاکھ روپیہ سالانہ کی ہے، اُن کی تعداد ۱۰۰ سے کچھ زائد ہے - مگر ان بڑے بڑے لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ ٹیکسوں کی ادائگی کے بعد اُن کے پاس اُن کے ہر پونڈ میں سے اُن کے لئے ایک شلنگ سے بھی کم رقم بچتی ہے - چنانچہ ان بڑے بڑے ٹیکسوں کی وجہ سے عام طور پر امیر لوگ بھی نسبتاً غریب ہو گئے ہیں - مثال کے طور پر مسٹر چرچل کو دس ہزار پونڈ کی سالانہ تنخواہ ملتی ہے - مگر وہ ٹیکسوں میں ۶۸۳۲ پونڈ ادا کر دیتے ہیں - اُن کے پاس ۳۰۰۰ پونڈ سے کچھ ہی زاید رقم بچتی ہے - اگر برطانوی قوم یہ چاہے کہ مسٹر چرچل اپنی "دس ہزار سالانہ بلا ٹیکس" کی تنخواہ سے لطف اندوز ہو سکیں تو ایسے برطانوی وزیر اعظم کی ۲۶۶۹۶۰ پونڈ سالانہ کی تنخواہ منظور کرنا پڑے گی کیونکہ اسی صورت میں ٹیکس کی وصولیابی کے بعد مسٹر چرچل کو دس ہزار پونڈ سالانہ کی بچت ہوگی -

بڑے بڑے مالی اداروں سے ایسے لوگ بھی متعلق ہیں جو عالمگیر شہرت کے مالک ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خود کروڑ پتی یا لکھ پتی نہیں ہیں - چنانچہ انگلستان کے ایک لارڈ ۲۰ کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں - ان کمپنیوں کا مجموعی سرمایہ دس کروڑ پونڈ یعنی ایک ارب ۵۰ کروڑ روپئے کے قریب ہے - مگر وہ خود لکھ پتی نہیں ہے اور معمولی حالت سے رہتے ہیں - یہی حالت بنک آف انگلینڈ کے گورنر مسٹر مانٹیگ نارمن کی ہے - مگر برطانیہ کے بڑے لوگ کنجوس نہیں ہیں - لارڈ نفیلڈ نے آکسفورڈ یونیورسٹی اور طبی درسگاہوں کو لاکھوں پونڈ دئے ہیں - اسی طرح سے والٹر ولس (Walter Wills) نامی مشہور انگریز مخیر نے برسٹل یونیورسٹی کو ۲۵ ہزار پونڈ دئے تھے تاکہ وہاں ایک نیا شعبۂ تحقیقات کھولا جا سکے - اس شعبہ کے لئے مشہور امریکن کروڑ پتی نے ۵۰ ہزار پونڈ دئے تھے - مگر بڑے بڑے ٹیکسوں کی وجہ سے اس قسم کی امدادی رقوم میں بہت زیادہ کمی ہو جائے گی - اس میں شک نہیں کہ برطانیہ کا جنگی قرضہ ابتک دس لاکھ پونڈ ہے اگر اسکے باوجود اس رقم سے اتنی آمدنی نہیں ہوگی جو ان ٹیکسوں کا بدل ہو سکے - ایک بہت امیر انگریز کی جو ابتک غیر شادی شدہ ہے ڈیڑھ لاکھ پونڈ سالانہ کی آمدنی ہے مگر اسے ٹیکسوں میں ۱۴۲۹۲۴ پونڈ ادا کرنا پڑتے ہیں - جنگ کے بعد ڈاکخانہ میں اس کی محض ۶۰ پونڈ کی رقم بطور قرض کے واجب الادا رہ جائے گی -

برما روڈ اور چین کی دوسری سڑکیں

جنگ کے زمانہ میں سامان جنگ کی فراہمی سے زیادہ اس سامان کے لانے لیجانے اور فوجوں کی بروقت نقل و حرکت کا سوال سامنے آتا ہے اور اسکے لئے بہترین ذریعہ صرف ریلوے بلکہ سڑکوں کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ موجودہ جنگ میں اور بہت سے اہم مسایل کے ساتھ سڑکوں کی تعمیر و درستی کا مسئلہ بھی خاص اہمیت رکھتی ہے - جاپان نے چین کی ناکہ بندی کی تو چین نے ایک لاکھ ستر ہزار قلیوں اور دو ہزار انجینروں کی مدد سے عبدالمالک سے لڑائی اور رسد کا سامان چین کو پہونچتا رہا اور پہونچتا ہے - درمیان میں تین پہنچنے کے لئے یہ سڑک برطانوی حکومت نے بند کر دی تھی تاکہ جاپان کسی طرح مایل بہ امن و سکون ہو جائے، لیکن جب اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو یہ سڑک پھر کھول دی گئی — اس سڑک کے علاوہ چین نے ایک سڑک اور طیار کی جو ۲۰۰۰ میل قطعہ لمبی ہے اور چونگ کنگ سے ماسکو تک جاتی ہے - اس سڑک میں سو میل کا ایک ایسا ٹکڑا ہے جسے صرف عورتوں نے بنایا ہے اس حال میں کہ بچے ان کی پیٹھ پر ہوتے تھے اور صرف اُبلی ہوئی ترکاری کھا کر زندگی بسر کرتی تھیں — ایک تیسری سڑک اور بھی ہے جو چونگ کنگ کو انڈو چائنا سے ملاتی ہے اور اسکی لمبائی ۱۲۱۴ میل ہے - یہ سڑک بہت خطرناک ہے یعنی دریاؤں کی طغیانی کی وجہ سے اکثر زیر آب ہو جاتی ہے اور کنارے کے پہاڑوں سے چٹانیں گر گر کر راستہ روک دیتی ہیں، لیکن چینی فوج برابر اسے صاف کرتی رہتی ہے اور باوجود اس کے جاپانی بم گرا گرا کر اس کو توڑتے رہتے ہیں چینی اس کو درست حالت میں رکھنے کی پوری کوشش کرتے رہتے ہیں - اب کہ جاپان کا انڈو چائنا پر قبضہ ہو گیا ہے، یہ سڑک زیادہ کام دیگی اور اگر برما انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو برما روڈ بھی غالباً بیکار ہو جائے، لیکن وہ سڑک جو اسکو تک جاتی ہے، وہ قایم رہے گی اور چین کو سامان جنگ اُس راستے سے پہونچتا رہے گا -

باب الاستفسار

شرحِ کلامِ مومن

(جناب سید سجاد علی میرزا - سہارن پور)

اکتوبر ۴۱ء کے نگار میں جہاں تک آپ نے مومن کے مشکل اشعار کا حل میرے اشعار کے جواب میں کیا تھا، اس سے آگے چند اشعار اور پیش کرتا ہوں - ازراہ کرم توجہ فرمائیے - میں چاہتا ہوں، اسی طرح آہستہ آہستہ یہ شرح مکمل ہو جائے - اشعار حسب ذیل ہیں :-

(۱) اور ہی رنگ آج ہے عارضِ گلعذار کا — خونِ دل اپنا تھا مگر گونۂ رخ طراز میں

"گونۂ رخ طراز" کیا ؟

(۲) کیوں نہ آدھی رات تک جاگے وہ جھکا دھیان ہو — آہوئے نیمخواب میں نرگسِ نیم باز میں

پہلا مصرع غلط معلوم ہوتا ہے - شعر کا مطلب بھی تحریر فرمائیے

(۳) بن ترے بزم سور میں ہیں یہ تیا متیں کہ ہے — نفخۂ صور کا اثر نغمۂ نے نواز میں

"بزم سور" کیا ؟

(۴) اُن سے اب التفات کی غیر کو پیش شکایتیں — سن کے مرا مبالغہ منت احتراز میں

اس شعر کا مفہوم بالکل سمجھ میں نہیں آیا -

(۵) پردہ نشیں کے عشق میں پردہ دری نہ ہو کہیں — ہوتی ہیں بے حجابیاں جانِ نہفتہ راز میں

شعر کا مفہوم مطلوب ہے اور "جانِ نہفتہ راز" کیا ؟

(۶) منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں — آتا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

(۷) سیدھا نہ کر دیا ہو مرے ذوقِ قتل نے — قاتل کے آگے گردنِ اغیار خم نہیں

(۸) غیرت کی جا ہے رام نزاکت ہوا وہ شوخ — وحشت کا جوش کیونکہ نہ ہو مجھ سے رم نہیں

(۹) کیا خوش ہوں کوئے غیر میں گر نقش پا نہ ہو — وہ شوخ جانتا ہوں کہ ثابت قدم نہ ہو

(۱۰) جانا حرام ہجر بتاں میں تو کیا گناہ — پیرِ مغاں شراب ہے شیشہ میں کم نہیں

(۱۱) بے التفاتیاں جو عدو سے سنی نہ تھیں — ہم جانتے تھے وصل میں رنج و الم نہیں

(۱۲) بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا — مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

(۱۳) ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں — سچ ہے کہ مجھ میں طاقتِ جور و ستم نہیں

(۱۴) عاشق کشی ہے شیوہ اگر بوالہوس سہی — آخر کچھ اپنی جان کے دشمن تو ہم نہیں

(۱۵) تلخیِ خسرو و شیریں کام شادی مرگ کیا — جانکنی ہے انتقام کوہکن کی فکر میں

(۱۶) دہم عشق لالہ رو سے داغِ دل کیا کیا کھلے — جان کر گلچیں کو تاراج چمن کی فکر میں

(۱۷) خاک میں وہ تپش نہیں خار میں وہ خلش نہیں — کیوں نہ ہمیں زیادہ ہو جوشِ جنوں بہار میں

(۱۸) مرگ ہے انتہائے عشق یاں ہی ابتدائے شوق — زندگی اپنی ہو گئی رنجشِ بار بار میں

(۱۹) مانے نہ مانے منعِ تپشہائے دل کروں — میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

(۲۰) مرتا ہوں کس عذاب سے ہے وقت جبھی میں ہو — اس دم دعا برائے تمنائے دل کروں

(۲۱) جاں دیدوں ہے اس آفتِ جاں سے معاملہ — بس کب تک انتظار تقاضائے دل کروں

(۲۲) وہ علم الرغم عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں — ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

(۲۳) محضرِ قتل ہے مکتوب گنہگاروں کا — سرقہ صد کو وہ فتوے سے رقم کرتے ہیں

(۲۴) اپنے سودے کی نہ پوچھو کہ خریدار کے ساتھ — جنس میں تو ہے دل اور بیع سلم کرتے ہیں

(۲۵) کشتۂ یار ہوں اس رشکِ مسیحا ہی جہاں — وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں

(نگار) - ۱ - "گونۂ رخ طراز" سے مراد "گلگونۂ رخ طراز" ہے، یعنی وہ غازہ جو چہرہ میں حسن و دلکشی پیدا کر دیتا ہے -

۲ - پہلا مصرعہ تقطیع سے گرتا ہے - بجائے کیوں کے کیونکہ پڑھئے - آہوئے نیمخواب اور نرگسِ نیم باز ایک ہی چیز ہے، یعنی معشوق کی نیم باز آنکھیں - مطلب واضح ہے -

۳ - بزمِ سُور، یعنی بزمِ عیش و نشاط -

۴ - مجھ سے محبوب نے احتراز شروع کیا تو میں نے اس پر اظہارِ شکر کیا، غیر نے یہ سمجھ کر کہ شاید معشوق کا احتراز ہی کام کی بات ہوئی خود بھی التفات یار سے بیزار ہو کر اس کی شکایتیں شروع کر دیں -

۵ - "جانِ نہفتہ راز" - یعنی وہ جان جس کا راز پوشیدہ ہے - شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی جان دینے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں اس سے کسی پردہ نشیں کے عشق کی پردہ دری نہ ہو - (جان نہفتہ راز میں بے حجابی اسی وقت ہوگی جب وہ نکلے گی)

۶ - مومن نے مکر شاعرانہ سے کام لیا ہے - محبوب سے کہتا ہے کہ میں تم سے اتنا دور رہا ہوں کہ ہجراں میرے لئے غم کی چیز نہیں، اس لئے اگر واقعی مجھے ستانا چاہتے ہو تو مجھ سے ملو کیونکہ ستم کی بہتر صورت یہی ہے -

۷ - اغیار میرے شوق قتل کو دیکھ کر ہمت ہار گئے اور اس لئے اب قاتل کے آگے ان کی گردن جھکی ہوئی نظر نہیں آتی -
دوسرے مصرعہ سے یہ مفہوم بھی اظہار ہوتا ہے کہ اغیار محبوب کی اطاعت سے باہر ہو گئے ہیں - (گردن خم کرنا، اطاعت قبول کرنے کو بھی کہتے ہیں)

۸ - یہ دیکھ کر کہ محبوب فرط نزاکت کی وجہ سے اب مجھ سے گریز نہیں کرتا، مجھے وحشت ہوتی ہے، کیونکہ جب مجھ سے احتراز نہیں تو ظاہر ہے، غیروں سے بھی نہ ہوگا -

۹ - اگر کوئے غیر میں محبوب کا نقش پا نظر نہیں آیا تو خوشی کی بات نہیں، کیونکہ جانتا ہوں وہ کسی بات میں ثابت قدم نہیں ہے اور ہو سکتا ہے وہ کسی اور جگہ پہونچا ہو یا یہ کہ غیر کے پاس آنے جانے لگے

۱۰ - اگر ہجر یار میں شراب کو میں نے حرام جانا تو کیا گناہ کیا - اگر شراب زہر ہوتی تو البتہ اس عالم میں اُسے پی جاتا -

۱۱ - چونکہ ہنگام وصل کسی بے اتفاقی کا حال دشمن سے نہ سُنا تھا، اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ وصل میں رنج والم نہیں ہوتا، لیکن یہ خیال غلط نکلا اور محبوب وصل میں بھی ہم سے محترز ہی رہا

۱۲ - اگر دشمن کو بے خطا پامال کیا تو تم اس سے یہ خیال نہ کرو کہ میں اپنے انجام سے ڈر کر ترک محبت کر دوں گا -

۱۳ - ناصح نے مومن سے کہا کہ تم جور وستم برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے اس لئے محبت ترک کر دو - اس کے جواب میں مومن کہتا ہے کہ شاید اس لئے میں تیری باتیں برداشت نہیں کر سکتا -
(گویا بالفاظ دیگر ناصح کی نصیحت کو انتہائی جور وستم ظاہر کیا گیا ہے)

۱۴ - اگر وہ سچے عاشقوں ہی کو ہلاک کرتا ہے تو پھر ہم بھی ہوس پرستی اختیار کریں گے، کیونکہ ہم بھی تو اپنی جان کے دشمن نہیں ہیں -

۱۵ - اگر خسرو، اپنے رقیب کوہکن کی موت پر فرط خوشی سے مر نہیں گیا بلکہ بے چین ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اُس سے کوہکن کا انتقام لیا جا رہا ہے -

۱۶ - یہ دیکھ کر کہ گلچیں تاراج چمن کی فکر میں ہے، میرے داغ دل تازہ ہوئے، کیونکہ مجھے یہ وہم پیدا ہوا کہ کہیں وہ اُس لالہ رو کی محبت میں نہ مبتلا ہو اور اسی لئے پھولوں کو توڑ رہا ہو کہ یہ اس سے مشابہ ہیں -

۱۷ - بہار میں جوش جنوں بڑھ جانے کی شاعرانہ تاویل کی ہے کہ میں تو صرف خلش اور تپش کا شایق ہوں چونکہ بہار میں ان چیزوں کی کمی ہو جاتی ہے اس لئے مزاج جنوں بڑھ جاتا ہے

۱۸ - بخیہ بار بار کی وجہ سے عشق کو انتہا نہ ہو سکی اور اس لئے جان بچ گئی، ورنہ ظاہر ہے کہ عشق کی انتہا میں مرنا ہی پڑتا -

۱۹ - تماشا کرنا یعنی نمائش کرنا - مطلب یہ کہ میں غیر تو ہوں نہیں کہ دل کی بیتابیوں کی نمائش کرتا پھروں، اس لئے میرا فرض یہی ہے کہ میں تپش دل نہ ظاہر ہونے دوں -

۲۰ - مشہور ہے کہ جانکنی کی تلخی کے وقت ایک ساعت قبول دعا کی بھی آتی ہے، اس لئے مومن کہتا ہے کہ میں جس تکلیف سے جان دے رہا ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید قبول دعا کا وقت یہی ہے اس لئے جی چاہتا ہے کہ تمنائے دل پوری ہونے کی دعا کروں -

۲۱ - میں کب تک اس کا انتظار کروں کہ وہ دل کا تقاضہ کرے اور دل دیکر جان کو مصیبت میں ڈالے، آخر کار جان دینا ہی ہے، اس لئے کیوں نہ اس سے پہلے ہی اس جھگڑے کو ختم کر دوں -

۲۲ - "بعد الرغم عدو" یعنی دشمن کی ضد میں - یعنی محض دشمن کی ضد میں مجھ پر لطف ہونا بڑا ستم ہے -

۲۳ - ہم نے قاصد کے ذریعہ خط بھیجا تو معشوق نے اس جرم میں اسے قتل کر دیا - گویا ہم گنہگاروں کا مکتوب ہی محضر قتل تھا جس سے فتوائے قتل حاصل کیا گیا -

۲۴ - "بیع سلم" اس بیع کو کہتے ہیں جس میں خریدار فروخت شدہ شے پر فوراً قابض نہ ہو سکے - مطلب یہ کہ دل کا سودا بھی گویا "بیع سلم" کا سا ہے کہ مالک تو اس کا ہو جاتا ہے کوئی اور لیکن وہ بیچنے والے کے پاس ہی رہتا ہے -

۲۵ - رقیب میری موت کا غم نہیں کرتے بلکہ وہ اس رشک میں مبتلا ہیں کہ مومن تو کشتۂ یار ہوا اور وہ نہ ہو سکے -

---

نگار کا "مومن نمبر" مطلوب ہے - حسب ذیل پتہ سے خط و کتابت کیجئے :- اکرام الدین - مشرف منزل - سول لائن علی گڈھ

مطبوعات موصولہ

فردوسِ تخیل | مجموعہ ہے مرحومہ زاہدہ خاتون شروانی کی منظومات کا، جنھوں نے اب سے ۲۵ سال پہلے، ہماری شاعری کی دُنیا میں اپنی نظموں سے ہلچل سی ڈال دی تھی یہ نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم کی صاحبزادی تھیں اور انھیں کی تربیت میں انھوں نے علوم مشرقی سے استفادہ کیا تھا۔ ذوقِ ادب بھی انھیں باپ کی طرف سے ملا تھا اور فکر و خیال کی پاکیزگی بھی خاندانی ورثہ تھی۔

ایک عورت کا کلام محض اس وجہ سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ عورت کا ہے، چہ جائیکہ وہ واقعی خوب و پاکیزہ بھی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب مرحومہ کی نظمیں اول اول سامنے آئیں تو لوگ حیران رہ گئے اور پھر تو "ز۔ مح۔ ش" نے ایسی رومانی فضا پیدا کردی کہ ادبی صحبتوں میں اکثر یہی چرچا نظر آنے لگا۔

مرحومہ نے ۲۸ سال کی عمر میں شادی سے قبل ہی وفات پائی لیکن ان کی شاعری کی عمر ۱۰ سال سے زیادہ نہ تھی اور اس قلیل مدت میں جو کچھ اور جتنا کچھ انھوں نے کہا وہ ان کی غیر معمولی ذہانت اور سنجیدہ غور و فکر کا ثبوت ہے۔

اس مجموعہ میں تقریباً ۱۲۵ نظمیں ہیں جو تین ادوار میں تقسیم کی گئی ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مرحوم کے کلام میں اول ہی کافی پختگی پائی جاتی تھی جو رفتہ رفتہ تیسرے دور میں زیادہ دلنشین ہوگئی تھی مرحومہ کی بعض فارسی نظمیں بھی اس میں شامل ہیں، جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان میں بھی کتنی پختہ دستگاہ رکھتی تھیں۔

افسوس ہے کہ اسوقت تک اس مجموعہ کے بالاستیعاب مطالعہ کی سعادت ہم کو حاصل نہیں ہوئی، لیکن سرسری نگاہ کا فیصلہ یہی ہے کہ طبقۂ نسواں میں زاہدہ خاتون شروانی کی سی شاعرہ ہمارے زمانہ میں کوئی پیدا نہیں ہوئی۔

دارالاشاعت پنجاب نے اسکی اشاعت میں بھی نہایت اہتمام سے کام لیا ہے۔ نہایت چکنا آرٹ پیپر، بہترین طباعت و کتابت، مرصع سرورق، خوبصورت جلد اور قیمت صرف ۸ عہ۔

منٹو کے افسانے | مجموعہ ہے سعادت حسن صاحب منٹو کے ۲۶ افسانوں کا جسے مکتبۂ اُردو لاہور نے خاص اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ منٹو پنجاب کے مشہور افسانہ نویس و ڈرامہ نگار ہیں ان کے افسانے مختلف رسایل میں شایع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں اور اگر یہ صحیح ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہجو و تضحیک بھی ایک نوع کا اعتدالِ خوبی ہے تو "دین دنیا" نے اسوقت تک منٹو کے افسانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کافی ثبوت ان افسانوں کی خوبی کا ہے۔

منٹو ترقی پسند حلقہ کے ممبر ہیں اور باوجود اس کے کہ اب تک یہ متحقق نہیں ہو سکا کہ یہ جماعت لٹریچر میں کیا انقلاب و ترقی چاہتی ہے، ہم کو افسانوں کی تراش و خراش میں یقیناً بہت سی اچھوتی باتیں نظر آتی ہیں اور نفسیاتی تجزیہ اور پلاٹ کی خصوصیات کے لحاظ سے بھی ہم ان افسانوں کو پڑھکر ایسا محسوس کرتے ہیں کہ لٹریچر کا یہ دور یقیناً پہلے دور سے بالکل علاحدہ ہے جس میں تخیل کم لیکن فکر و تخیل زیادہ ہے۔ ان افسانوں میں نیا قانون، ہتک، شغل اور شرابی خصوصیت کے ساتھ نہایت خریدنے کی قیمت ۸ عہ اور ملنے کا پتہ: مکتبۂ اُردو لاہور۔

نئے زاویے | مجموعہ ہے مختلف حضرات کے مضامین نثر و نظم کا، جو سب کے سب ترقی پسند جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے تمام افسانوں اور منظومات سے ہمیں اُن جدید رجحانات کا پتہ چلتا ہے، جنھوں نے ہمارے زمانہ کی کتاب فکر و احساس کا بالکل نیا ورق اُلٹ دیا ہے۔ اس سے قبل ہمارا لٹریچر یا واقعیت بھی شاعری اور ادب لطیف کا رنگ لئے ہوئے تھی، لیکن اب شاعری اور ادب لطیف میں بھی زیادہ تر مادی واقعیت اور تلخ حقیقت سے بحث کی جاتی ہے اور نئے زاویے میں جتنے افسانے اور منظومات شایع کئے گئے ہیں وہ سب اسی نئی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔

نظم نگاروں میں جوش، فیض، احمد ندیم قاسمی، مجاز، احسان دانش اور افسانوں میں منٹو، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی اور احمد علی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" اس مجموعہ میں غالباً "آخری لفظ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجلد نسخہ کی قیمت تین روپیہ غیر مجلد کی دو روپیہ ملنے آنے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ اُردو لاہور۔

ماوراء جناب ن۔م راشد کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر قافیہ و ردیف کی پابندی سے معرّا اور مفہوم کے اعتبار سے بالکل نئے زمانہ کی چیزیں ہیں، جن کے سمجھنے کے لئے خاص سمجھ پیدا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمارے لٹریچر میں بھی زبردست انقلاب پیدا ہو رہا ہے، لیکن چونکہ ابھی تک ہم عبوری یا برزخی دور سے نہیں گزر چکے ہیں، بنابراں ہر چیز (Chaotic) حالت میں ہے اور اسی لئے راشد صاحب اور اسی نوع کے انقلابی شاعروں کے کلام میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بظاہر الفاظ خوبصورت، خیالات کا میلان بلند، لیکن طرزِ ادا اُلجھی ہوئی اور جا بجا جدت پسندی ثقیل و ناگوار!

راشد صاحب کی شاعری انگلستان کے ایک نوجوان شاعر ولیم امپسن (William Empson) سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اس کا قول بھی یہی ہے کہ نظمیں پیچیدہ اور مبہم سی ہونی چاہئے کیونکہ اس طرح ہم کو ان کے سمجھنے کے لئے ذہانت سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یورپ میں جو اسوقت (Futurism) آرٹ کا ہنگامہ برپا ہے، اُسی سے وہاں کی بھی شاعری متاثر ہو رہی ہے اور اسی کی صدائے بازگشت ہندوستان میں بھی کہیں کہیں سننے میں آجاتی ہے۔ بہرحال راشد صاحب کی شاعری یقیناً بالکل نئی چیز ہے لیکن شاید اس کا تعمیری دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ زمانہ کے بعد اس میں پختگی پیدا ہو کر وہ "پہیلیوں" سے گزر کر ایسی "حکایتِ حال" میں تبدیل ہو جائے جو عام انسانوں کی سمجھ سے باہر نہ ہو۔

یہ مجموعہ بھی مکتبۂ اُردو لاہور سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

روٹھی رانی منشی پریم چند مرحوم کا ایک طویل فسانہ ہے جو سرزمین مارواڑ کے راجستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت جو کچھ ہو، لیکن افسانوی حیثیت سے اس کی خوبی مسلّم ہے۔ منشی پریم چند زیادہ تر دیہات کے معاشرتی افسانے لکھا کرتے تھے، لیکن اس میں وہ راجاؤں کی رنواس تک پہونچ گئے ہیں اور اخیر میں رانیوں کے ستی ہونے کے دلدوز واقعہ پر اس افسانہ کو ختم کیا ہے ..... اس داستان کی ساری خوبی یہ ہے کہ باوجود حد درجہ رومانیت کے انداز بیان کا تاریخی رنگ بھی اس میں کافی پایا جاتا ہے اور گیرکٹروں کی کثرت کے باوجود پلاٹ زیادہ اُلجھنے نہیں دیا۔ قیمت بارہ آنے ہے اور ملنے کا پتہ لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔

کربلا منشی پریم چند مرحوم کا ڈرامہ ہے، جس میں انھوں نے کربلا کے مشہور واقعہ کو پیش کرتے ہوئے، یزید اور حسین کے کردار کو اُبھارا ہے۔ اس ڈرامہ کی بنیاد جن واقعات و حالات پر قایم ہے وہ زیادہ تر "ذکر الشہادتین" وغیرہ معمولی قسم کی کتابوں سے حاصل کئے گئے ہیں، اس لئے مبالغہ سے خالی نہیں۔ لیکن ایک فسانہ یا ڈرامہ کی تعمیر کے لئے ضروری تھا کہ اگر اس قسم کا لٹریچر پہلے سے موجود نہ ہوتا، تو ڈرامہ نگار کو خود اپنی طرف سے "زیب داستان" کے لئے اس نوع کے زواید اضافہ کرنا پڑتے۔

میری رائے میں اس قسم کے واقعات جنھوں نے ایک جماعت کے بالکل دو ٹکڑے کر دئے ہیں، ڈرامایا افسانے کی صورت میں کبھی نہ آنا چاہئے، کیونکہ ان سے اور زیادہ اُلجھنوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن پریم چند صاحب چونکہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے وہ محسوس نہ کر سکتے تھے کہ انھوں نے یہ کوئی اچھا اقدام نہیں کیا ہے۔ اسوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ فدک اور جمل کے قصوں کو فراموش کر کے مل بیٹھنے کی صورتیں پیدا کی جائیں نہ کہ ان میں رنگ آمیزی کر کے جذبات کو اور مشتعل کیا جائے۔ ڈرامہ کے لحاظ سے بھی یہ چیز اچھی نہیں، کیونکہ تمثیل کے لئے جن چست و مختصر فقروں کی ضرورت ہے اُن سے یہ کتاب محروم ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور۔

ایک مُعلّم کی زندگی عبدالغفار صاحب مدھولی، جامعۂ ملیہ دہلی کے مدرسۂ ابتدائی کے مدرس ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں انھیں کی لکھی ہوئی ہے جس میں انھوں نے اپنی اکیس سال کی جامعی زندگی کو شروع سے اسوقت تک قلمبند کیا ہے۔ عبدالغفار صاحب نے شروع سے جامعۂ ملیہ ہی میں تعلیم پائی اور یہیں اب وہ عرصہ سے مدرس کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی متعلمانہ و معلمانہ دونوں زندگیوں کا حال اس قدر دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ اس کے پڑھنے میں ایک افسانہ کا سا لطف حاصل ہوتا ہے۔ رہا کتاب کا افادی پہلو، سو میں سمجھتا ہوں کہ اُردو میں "فن تعلیم" پر شاید ہی کوئی ایسی مفید کتاب اتنے دلچسپ طریقہ سے لکھی گئی ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ ملیہ کا نظام تعلیم کتنا پاکیزہ و بلند ہے اور وہاں بچوں کی سیرت کتنی استوار بنیاد پر تعمیر کی جاتی ہے۔ عبدالغفار صاحب شروع ہی سے جامعہ ملیہ کا عشق لیکر حیدرآباد سے آئے تھے اور اب بھی ایک مخلص عاشق کی طرح وہاں کام کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب نہ صرف بچوں کو پڑھائی جائے بلکہ ان کے والدین و اساتذہ کے مطالعہ سے بھی گزرے، تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ صحیح تعلیم و تربیت کا حقیقی راستہ کیا ہے۔ قیمت ہر جلد کی ڈھائی روپیہ ہے، جو اس کی طباعت، کتابت، کاغذ اور جلد کی خوشنمائی کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

نغمۂ زندگی مجموعہ ہے جناب سید مفضل احمد کریم مفضلی بی۔ لٹ (آکسن) آئی، سی، اس (بنگال) کی غزلوں اور نظموں کا جو کلکتہ کی مشہور فلم ساز کمپنی "مفضلی برادران لمیٹڈ" کے روح رواں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں کا رجحان غزل میں "معمہ سخنی" کی طرف زیادہ ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مفضلی صاحب زمانۂ حال

میں ماضی کی چیز نکلے۔ " وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ! " کہا جاتا ہے کہ پچھلے زمانہ کی شاعری میں ایہام کا عیب بہت تھا، لیکن اب اس سے زیادہ ایہام کا عیب ہے لیکن فضلی صاحب کا یہ مجموعہ اس عیب سے بالکل پاک ہے۔

ان کے کلام میں اک سہل گفتگو کی سی سادگی و روانی پائی جاتی ہے اور ہم اسے بجا طور پر سہل ممتنع کہہ سکتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یہ رنگِ گلستاں، یہ عمرِ گریزاں — کہوں کیا الٰہی کہ کیا چاہتا ہوں۔
کبھی کچھ سوچ کر رونا، کبھی کچھ سوچ کر ہنسنا — خدا ہی جانے کیا دل میں مریضِ غم کے پنہاں تھا
خفا وہ کیا ہوئے، عالم خفا ہے — جسے دیکھو وہی کچھ کہہ رہا ہے

اس مجموعہ میں جو نظمیں ہیں، ان کی زبان کی شستگی و رنگی کا بھی یہی حال ہے۔ یہ مجموعہ نہایت نفیس آرٹ پیپر پر بیرونی ٹائپ میں چھاپا گیا ہے اور جلد و طباعت کی پاکیزگی کو دیکھ کر دیوان غالب کا برلن والا نسخہ سامنے آجاتا ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ :۔ دفتر انجمن ترقی اُردو، دہلی۔

داستان تاریخ اُردو

مولوی حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ کی تالیف ہے، جسے لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ نے شائع کیا ہے۔ اس موضوع پر اسوقت متعدد کتابیں ہمارے سامنے موجود ہیں، لیکن شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولوی حامد حسن صاحب کی یہ تالیف اپنی جامعیت، حسنِ ترتیب کے لحاظ سے خاص امتیاز کی مالک ہے۔ ابتدا میں اُردو زبان کی اصلیت اور اس کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے، اب سے دو سو سال قبل تک کی اُردو شاعری کا ذکر کرکے اس حصہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد نثر نگاری کے چھ دور قائم کرکے مشاہیر نثر نگار حضرات کے حالات اور ان کی تصانیف کے اقتباسات درج کرکے ان پر تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ باوجود اختصار کے اتنی تحقیق و کاوش کا حامل ہے کہ مجھے تو یہ کتاب تاریخ نثر اُردو کی اچھی خاصی سائکلوپیڈیا معلوم ہوتی ہے۔ دورِ حاضر کو البتہ انھوں نے نہیں لیا، نہایت سرسری اس سے گزر گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب کافی ضخیم ہوگئی تھی لیکن اگر دورِ حاضر کو شامل کرکے یہ کتاب بجائے ۵۰۰ صفحات کے ۸۰۰ صفحات کی ہو جاتی تو زیادہ حرج نہ تھا، بہرحال کتاب بہت مفید ہے اور اُردو کے ہر ادیب کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ ہے اور کاغذ بھی بہت دبیز استعمال کیا گیا ہے۔

مولانا محمد علی کے یوروپ کے سفر

پروفیسر محمد سرور صاحب جامعہ ملیہ دہلی نے تمام ان مقالات و مکتوبات کو جو مولانا محمد علی مرحوم نے اپنی مغربی سیاحتوں کے متعلق لکھے تھے یکجا کر دیا ہے۔ ۱۸۹۸ء سے لیکر ۱۹۳۰ء تک جتنی بار انھوں نے ولایت کا سفر کیا ہے، ان سب کا ذکر اس مجموعہ میں پایا جاتا ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم جن خصوصیات کے انسان تھے اُن کو سمجھنے کے لئے ان مقالات و مکاتیب کا مطالعہ ضروری ہے اور پروفیسر محمد سرور صاحب ان کی شیرازہ بندی کرکے یقیناً بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔ اس کی قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ کتاب خانہ پنجاب۔ لاہور۔

آج کا مصر

پروفیسر محمد حسن (اعظم گڈھی) جو جامعۂ ازہر قاہرہ میں عربی تعلیم حاصل کرنے گئے تھے، اور اب فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہیں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ رخصت لیکر ہندوستان آئے تھے۔ وہیں اُن کے ایک دوست عبدالسلام صاحب خورشید نے اُن سے مصر کے متعلق تازہ حالات حاصل کئے اور ایک جگہ قلمبند کر دیا۔ یہ کتاب انھیں معلومات کی شیرازہ بندی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصر سیاسی و اقتصادی حالات کے متعلق اس سے زیادہ تعمیر و صحیح ذریعہ ہماری معلومات کا اور کوئی نہیں ہو سکتا اس لئے جو حضرات مصر کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

یہ کتاب اُردو اکاڈیمی، لاہور نے شائع کی ہے اور خاص اہتمام کے ساتھ شائع کی ہے۔

حرف ناتمام

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی مرحوم کی غزلوں اور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ برق مرحوم، دہلی کے نہایت خوشگو شاعر میں تھے اور نظم و غزل دونوں خوب کہتے تھے۔ اس مجموعہ میں ۳۰ نظمیں اور تقریباً ۵۰ صفحات انتخاب غزلیات کے ہیں۔ لیکن کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذوق غزلگوئی زیادہ پاکیزہ تھا۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے بہت سوچ سمجھ کر کہتے تھے اور فارسی ترکیبوں کو بہت سلیقہ کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں

بہارِ خندۂ گل دیدنی ہے باغِ عالم میں — تماشا ہو گیا غنچہ کا شیرازہ بکھر جانا
ہمہ تن گوش ہوں سننے کو نوا ہائے دروں — کونسا نغمہ ہے جو تارِ رگِ جاں میں نہیں
رہے گا کس کا حصہ بیشتر میرے مٹانے میں — یہ باہم فیصلہ پہلے زمین و آسماں کر لیں

اس دیوان کی قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ جناب طالب بی۔ اے۔ چاوڑی بازار۔ گلی تباشاں۔ دہلی۔

مقام محمود مولانا عبدالمالک آروی کے تاریخی، ادبی، اور انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے جسے منیجر طاق بستاں آرہ نے شایع کیا ہے، اس مجموعہ میں تیرہ مقالے ہیں جنہیں سے پانچ نگار میں شایع ہوئے تھے اور باقی آٹھ دوسرے رسایل وجرایدمیں۔ مولانا عبدالمالک کا فضل وکمال نگار کے حلقہ میں اس قدر متعارف ہوچکا ہے کہ اُن کے مقالات کے متعلق کوئی رائے زنی تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ ضرورت تھی کہ ان منتشر اوراق علم وادب کو ایک شیرازہ سے منسلک کردیا جاتا اور اس لئے ادارۂ طاق بستاں کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے اس مفید کتاب کی اشاعت سے ہماری زبان کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ طاق بستاں آرہ

قابیل انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کی تمثیل کا ترجمہ ہے جناب مجنوں گورکھپوری کے قلم سے، جس کو دیکھ کر غالب کا مصرعہ۔ "ذکر اس پریوش کا اور پھر بیان اپنا"۔ یاد آجاتا ہے۔ اس تمثیل میں موت کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شیطان کے کردار کے ذریعہ سے ایک بلند انتقادی چیز پیش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری ادبیات میں اس نوع کے لٹریچر کا اضافہ بڑا مفید اضافہ ہے۔ قیمت ۱؎ ہے اور ملنے کا پتہ:۔ ایوان اشاعت، گورکھپور۔

نگار نامہ دفتر مکاتیب کا دوسرا حصہ ہے، جسے جناب ساغر نظامی نے ایشیا کے خاص نمبر کی جگہ شایع کیا ہے، اس سے پہلے ایک مجموعہ اور شایع ہوچکا ہے۔ اس میں اور بہت سے حضرات کے خطوط ہیں، جو پہلے مجموعہ میں شایع ہونے سے رہ گئے تھے۔ یہ گلدستہ ادارۂ ادبی مرکز میرٹھ سے ملسکتا ہے۔

ناکام جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی، دہلی کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جو بجا طور پر دہلی کی زبان جاننے والے کہے جاسکتے ہیں۔ یہ کتاب انھیں کے فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ نہ کوئی فسانہ ہے، نہ اصطلاحی حیثیت سے کوئی انتقادی تصنیف۔ لیکن اس کی ادبیت اور گہری ادبیت میں فسانہ وانتقاد دونوں شامل ہیں قیمت ۱۲؎ ملنے کا پتہ: مصنف کا نام اور پتا محل دہلی۔

سلیس اُردو انجمن ترقی اُردو حیدرآباد نے نثر ونظم کا یہ مجموعہ "سلیس اُردو" کے نام سے شایع کرکے بتایا ہے کہ اب ہمیں اس قسم کی زبان کی ضرورت ہے۔ مضامین مفید و پُراز معلومات بھی ہیں۔ یہ مجموعہ بالغ مبتدیوں کو اُردو سکھانے کے لئے شایع کیا گیا ہے اور یقیناً بہت کارآمد ہے۔ اس کی قیمت ۱۲؎ ہے۔

افراط گریہ شیعہ ریڈیکل سوسائٹی لکھیم پور کھیری، اثنا عشری مذہب کے بعض رسوم وقیود کے متعلق عرصہ سے خاموش اصلاحی خدمت انجام دے رہی ہے۔ یہ رسالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں بزم عزا کے صحیح مقاصد کو پیش کرکے گریہ وزاری کی کثرت پر منصفانہ نکتہ چینی کی گئی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرات شیعہ عام طور پر اس کو کس نظر سے دیکھیں گے، لیکن اہل فکر ضرور اس کی قدر کریں گے۔

صحت وصفائی محمد حسین صاحب حسان نے بچوں کے لئے صحت وصفائی کے متعلق فسانوی انداز میں بعض اسباق تحریر کئے ہیں جن کا مطالعہ بچوں اور بوڑھوں سب کے لئے مفید ہے۔ قیمت ۴؎۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔

انتظام کتب خانہ کتب خانہ کی تنظیم ایک خاص فن ہے جس کے حاصل کئے بغیر آجکل کسی جدید کتب خانہ کو جدید طریقہ سے مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب میں اسی فن پر بحث کی گئی ہے اور ایسے دو شخصوں نے کی ہے جو اس کا عملی تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو کتاب خانہ رکھنے کے شایق ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ قیمت ۸؎۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

خرمن عشق جناب شفیق جونپوری کا دیوان ہے، جس میں غزلیں، قصیدے، نظمیں اور بہت سے تاریخی قطعات بھی شامل ہیں۔ جناب شفیق، مولانا حسرت موہانی کے شاگرد ہیں اور اس وقت کے خوشگو شعراء میں سے ہیں۔

شروع میں بہت سے لوگوں کی تقریظیں بھی شامل ہیں۔ جن میں اقبال سہیل، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ کتابت وطباعت معمولی ہے۔ قیمت ایکروپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ جناب شفیق۔ جونپور۔

اسلام اور اس کا مستقبل مسٹر لیوپولڈ ویس، ایک انگریز نومسلم نے، ممالک اسلامی کی سیاحت کرنے کے بعد اسلام قبول کیا اور ایک کتاب لکھی جس میں اس نے اسلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ کتاب اسی کے بعض ضروری اجزاء کا ترجمہ ہے جسے مجتبیٰ حسن صاحب نے پیش کیا ہے۔ خیالات جتنے پاکیزہ ہیں، ترجمہ بھی اتنا ہی پاکیزہ ہے۔ کتاب بہت مفید ودلچسپ ہے۔ نظامی پریس لکھنؤ سے خط وکتابت کی جائے۔

جنوری ۴۱ء اور جنوری ۴۲ء کا نگار

دونوں ایک ساتھ مجلد کرائیے اور اگر ان میں سے کوئی پرچہ موجود نہ ہو تو ہم سے طلب کرلیجئے ورنہ چند دن بعد نہ ملے گا۔ منیجر نگار

آبگینے

ایک حقیقی شاعر ماحول سے کتنا متاثر ہوتا ہے؟ اس کا جواب آپ کو ذیل کی نظم سے ملے گا جو سرزمین کشمیر کی پیداوار ہے اور تعریف سے بے نیاز! (نیاز)

یاد آگیا پھر اک بُتِ رعنا، غضب غضب — رنگیں خرام، کیف سراپا، غضب غضب

سج دھج نرالی، وضع انوکھی، ادا نئی — آواز؟ جیسے گیت سُریلا غضب غضب

لہجے میں لوچ، لوچ میں وہ نرم زمزمہ — لہرا بجائیں جیسے کنہیا غضب غضب

آنکھوں میں نیند، نیند میں ڈورا خمار کا — نازک سے آبگینوں پہ مینا غضب غضب

وہ پتلیاں کہ "مانسروور" کی جھیل میں — "سپنوں کی ناؤ" کھیتے ہیں دیوتا غضب غضب

ابرو وہ بانکے، بات پہ تلوار سوت لیں — اور کردیں ایک "دیکھا نہ دیکھا"، غضب غضب

پلکیں گھنیری، گوپیوں کی ٹوہ کے لئے — "رادھا" کے جھانکنے کا جھروکا غضب غضب

اور اُن کی اور چھور وہ "چت چور" چتونیں — لوٹیں، مگر ذرا جو ہو کھٹکا غضب غضب

ان بستیوں میں پل کے جواں ہوں، جو مستیاں — اُن مستیوں کا کیا ہے ٹھکانا غضب غضب

پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل کہ ہائے ہائے — جیسے کنول کی تاک میں بھونرا غضب غضب

مدھ کی کٹوریوں میں وہ امرت گھُلا ہوا — جس کا ہے "کام دیو" بھی پیاسا غضب غضب

اُن لمبے لمبے بالوں میں گھونگھر کی لہر سی — کمر ڈٹ سے جیسے بہتی ہو گنگا، غضب غضب

اُن گورے گورے گالوں پہ اک لٹ لٹک پڑی — فوراً تھا چہرہ لال بھبوکا غضب غضب

وہ ہونٹ جن کو چوم رہی تھی شگفتگی — یاقوت اتنا سُرخ نہ چوکھا غضب غضب

وہ چُلبُلی ادائیں، اداؤں کے ساتھ ساتھ — نتھنوں کا بار بار پھڑکنا غضب غضب

اپنی ہنسی پہ غصہ، کبھی غصّے پر ہنسی — سُونا لٹا دیا کبھی روپا غضب غضب

اُف اُف وہ پور پور میں مہندی رچی ہوئی — ٹیسو کا پھُول دیکھا تو ہوگا؟ غضب غضب!

اس واسطے "چنگیر" ہتیلی کی دیکھ لوں — انگڑائی توڑنے کا بہانا، غضب غضب

بھڑکا رہی تھی حُسن کو گرمی شباب کی
کھنچتا تھا عطر یا تھا پسینا غضب غضب

اک تشنہ کام شوق کی حسرت بھری نظر — دل بیقرارِ عرضِ تمنا، غضب غضب

بہکے ہوئے سوال کا بہکا ہوا جواب — اُس پر دبا کے ہونٹ وہ کہنا "غضب غضب"

وہ التفات بخشِ بے حد کہیں جسے — پرسش کے بعد رنجشِ بیجا غضب غضب

گفتار کوشئ لبِ میگوں کے ساتھ ساتھ
شرمندگی ـ حیا کا تقاضا غضب غضب

بیتابیوں نے ہوش سے بیگانہ کر دیا — برہم ہوئی وہ بزم تماشا غضب غضب

اوجھل ہوا نگاہ سے وہ جانِ آرزو — محرومیاں ہیں اور دلِ شیدا غضب غضب

جوشِ جنوں میں وہ بھی اثرؔ چاک ہو گیا
ہلکا سا رہ گیا تھا جو پردا غضب غضب!

(خان بہادر) جعفر علی خاں اثرؔ بی۔اے

راستے

ارضِ ناقوس و اذاں جولانگہ اہلِ کتاب
وہ زمیں، بستے ہیں جس پر زہد کے پالے گناہ
برہمن زادوں کی گلیاں راہبوں کے رہگذر
زہد کی فتنہ گری زُنّار داروں کے فریب
خونِ آدم کا تلاطم رہگذر در رہگذر
رہگذاروں پر رواں تہذیب کے پروردگار
بُت گروں کے راستے پیغمبروں کے راستے
سیکڑوں تسبیح خواں ہیں سیکڑوں زُنّار دار
آہ وہ رستے رواں ہوں جن پہ ڈاکو سیکڑوں
روندتے ہوں جن کو منعم جن پہ چلتے ہوں امیر
سیکڑوں مفلوج جن رستوں پہ وقف خواب ہوں
کتنے عارف، کتنے صوفی، کتنے کعبہ کے امام
خاک برسر کیسے کیسے بے نوا خانہ بدوش
کتنی میلی چادریں ہیں کتنے برقعوں میں ہے خاک
سوختہ کتنے جگر ہیں کتنے سینے دلفگار
کس قدر جلوے غُبارِ راہ میں گم ہیں یہاں
کیسے کیسے بے سروساماں بڑھاپے صرف خواب
کتنے دل شعلہ بداماں کتنے سینوں میں ہے آگ
راستوں میں تپ رہے ہیں کتنے مردوں کے بدن
جانبِ دیر و کلیسا جانے والے رہگذار
خانقاہوں کے مقدس خواب دکھلاتے رہے
دور سے آغوش پھیلاتے ہیں کتنے راستے

اک شبِ بے ماہ و اختر اک سحر بے آفتاب
معبدوں کی کھڑکیوں سے جھانکنے والے گناہ
پے بہ پے کوچہ بہ کوچہ آدمیت کے مزار
ایسی کالی رات اور یہ چاند تاروں کے فریب
آدمیت کا جنازہ کفر و دیں کے دوش پر
دونوں جانب کوڑھیوں کی چیخ اندھوں کی پکار
نادروں کے راستے ہیں سنجروں کے راستے
اُٹھ رہا ہے ہم نفس وہ دیکھ رستوں سے غُبار
گام زن ہوں جن پہ چنگیز و ہلاکو سیکڑوں
ٹھوکریں کھا کھا کے سوتے ہوں جہاں اندھے فقیر
گود میں جن ساحلوں کی سیکڑوں سیلاب ہوں
گام زن ہیں کتنے قیدی، گرم رو کتنے غلام
کتنی آہیں، کتنی چیخیں، کتنے غم، کتنے خروش
کتنے دامن ہیں دریدہ کتنے پیراہن ہیں چاک
کتنی آہیں بے اثر ہیں، کتنی آنکھیں اشکبار
خون میں ڈوبے ہوئے کتنے تبسم ہیں یہاں،
کتنے افسردہ لڑکپن، کتنے پژمردہ شباب
آہ ان رستوں پہ ہیں اُجڑے ہوئے کتنے سُہاگ
کتنی لاشیں ہیں انہی رستوں پہ بے گور و کفن
اُف یہ سانپوں کی طرح لہرانے والے رہگذار
مرمریں آذر کدوں کے زمزمے گاتے رہے،
بن بلائے سامنے آتے ہیں کتنے راستے

ہم نوا میرا نہ کوئی ہم سفر میرے لئے
کتنی وحشت ناک ہے ہر رہگذر میرے لئے!

پروفیسر شور (علیگ)

غزل :

فراق گورکھپوری

بہار کیا ہے؟ اِسے گر کوئی کبھی دیکھے... تو اُس گُلِ چمن آرا کی تازگی دیکھے
یہ شانِ جلوہ گری خوب ہے کہ دیکھی آنکھ قریب ہی تجھے دیکھے نہ دور ہی دیکھے...
وہ آنکھ آئینہ اس دورِ انتشار کا ہو جو اُس کے گیسوے پُرخم کی برہمی دیکھے
نہ دل کو اپنے پہ قابو نہ تجھ پہ بس کوئی وہ اپنا گریۂ غم یا تری خوشی دیکھے
بھُلا کے عہدِ وفا جب وہ پاس آ بیٹھے بس ایسے میں کوئی اس کی سپردگی دیکھے
وہ جسم سربسر اک خوابِ شادمانی ہے کہ جیسے کوئی نہ آئی ہوئی ہنسی دیکھے
یہ وصل کا تھا کرشمہ کہ حُسن بھاگ اُٹھا ترے بدن کی کوئی اب خود آگہی دیکھے

کسی کے روٹھ کے مُنہ پھیرنے کی تھی یہ ادا
کوئی فراق کی جانب اگر کبھی دیکھے !

غزل :

تمکین سرمست

نیرنگِ دردِ دل کی کوئی انتہا نہیں اُس کا پتہ ملا تو ہمارا پتا نہیں
ہم یاد کر رہے اُنھیں کس امید پر ابتو غمِ فراق کا بھی آسرا نہیں
حالانکہ تم نے کب کا بھُلا بھی دیا، مگر تم مجھ کو بھول جاوگے دل مانتا نہیں
یہ یاد ہے کہ مجھ کو کسی کی تلاش تھی اب یہ خبر نہیں کہ ملا بھی وہ یا نہیں
اِک لمحۂ فریبِ اجل کے سوا مجھے کس وقت انتظار تمھارا رہا نہیں
نزدیک ہو کے دور ہوا کس سے جائے گا اور اس قدر قریب سے کچھ سوجھتا نہیں
دُنیا و دیں لٹا کے اُسے دیکھ تو لیا یہ اور بات ہے کہ کہیں کا رہا نہیں
منزل وہی ہے اپنی جہاں تھک کے بیٹھ جائیں مدِ نگاہِ شوق کوئی راستہ نہیں
کہنے کو اب بھی زندہ ہوں لیکن ترے بغیر کب زندگی پہ موت کا دھوکا ہوا نہیں
وصل و فراق کھیل ہیں نیرنگِ شوق کے ورنہ جنونِ عشق کا کچھ مدعا نہیں

تمکیں جفائے یار کو معلوم ہو تو ہو
اپنی وفا کا مجھ پہ تو عقدہ کھُلا نہیں